Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1970

اس پرچے میں

جماعت اسلامی کے

انتخابی منشور پر

تبصرہ

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

تیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ
پاکستان ـــــ ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

بدلِ اشتراک
سالانہ ـــ پاکستان ـــ دس روپے
سالانہ ـــ ہندوستان ـــ پندرہ روپے
سالانہ ـــ غیر ممالک ـــ ایک پونڈ

جلد (۲۳) | فروری ۱۹۷۰ء | نمبر (۲)

فہرست

۱۔ لمعات ـــــ ۳
۲۔ طلوعِ اسلام کالج ـــــ (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ـــــ ۱۳
۳۔ جماعت اسلامی کے منشور پر تبصرہ ـــــ ۱۷
۴۔ قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا؟ ـــــ ۳۹
۵۔ جمعیتہ علماء اسلام (ہزاروی گروپ) کا منشور ـــــ ۴۱
۶۔ جمہوریت یا فریبِ جمہوریت ـــــ ۴۵
۷۔ باب المراسلات ـــــ ۴۹
۸۔ حقائق و عبر ـــــ ۵۵
۹۔ بزمِ مذاکرہ ـــــ ۴۹-۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اگر کسی کے گھر کا دیا بجھ جائے تو اندھیرا اسی گھر تک محدود رہتا ہے لیکن جب سورج غروب ہو جائے تو اس سارے علاقے پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ دسمبر کے آخری ہفتہ میں فکرِ قرآنی کا ایک ایسا سراج منیر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جس سے سارا خطۂ سرحد تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ قرآنی روشنی کا جگمگاتا چراغ تھا — مردانِ کاخان عبدالحکیم خان — خدا رحمت کند آں پیکرِ مہر و محبت را —!

خان عبدالحکیم خان سے رفاقت کی مدت اتنی طویل تھی کہ مجھے یاد ہی نہیں پڑتا کہ ان سے پہلے پہل کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب میری قرآنی دعوت کا پہلا آوازہ بلند ہوا تو خان مرحوم اس پر لبیک کہنے کے لئے اپنی فطری سکراہٹ کیساتھ سامنے کھڑے تھے۔ اسکے بعد وہ جوں جوں قریب آتے گئے ان کے جوہر نمایاں اور ان کا رشتۂ خلوص و محبت محکم سے محکم تر ہوتا چلا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ میری قرآنی فکر کو جس عمدگی سے وہ سمجھتے تھے اور جس حسن و خوبی سے وہ اسے دوسروں کو سمجھاتے تھے، اس کی مثال بہت کم ملیگی۔ اس پر ان کی جرأتوں کا یہ عالم کہ سرحد جیسے متشدد و ملا زدہ علاقہ میں جہاں مروجہ عقاید اور متوارث رسومات کے خلاف ایک لفظ تک زبان پر لانا بھڑوں کے چھتے میں پتھر مار دینے کے مرادف ہوتا ہے وہ مردِ قلندر عمر بھر قرآنی علم کو بلند کئے نہ صرف کھڑا رہا بلکہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا اور مخالفتوں کا ہجوم اور مشکلات و مصائب کا سیلاب بھی اسکے پائے استقلال میں ذرا سی جنبش پیدا کر سکا اور نہ اس کے قلبِ مطمئن میں خفیف سا اضطراب۔ وہ این و آں سے بے خبر اور مصلحت کوشیوں کے اساس سے مستغنی، قرآنی روشنی کے عام کرنے میں دیوانہ وار مصروفِ جد و جہد رہا — چٹان کی طرح محکم، روشنی کے مینار کی طرح بلند، جوئے رواں کی طرح پُرسکوت، نسیمِ سحری کی طرح نرم و نازک، پاک باز و پاک بیں — نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز۔

مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق

یہ تھے پیکرِ جرأت و اخلاص، میرے رفیقِ سفر، خان عبدالحکیم خان۔ طوبیٰ لہٗ و حسن مآب!

حکیم خان! تمہیں عمر بھر کی رفاقت کا رشتہ، اس آخری منزل میں یوں جھٹک کر توڑ دینا چاہیئے تھا۔ بالآخر اتنی عجلت بھی کیا تھی — کوئی دن اور بھی جیتے ہوتے — اور پھر یہاں سے اکٹھے ہی چلتے۔ تم خود ہی سوچو کہ میں

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے؟

غمِ نصیب — پرویز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

مارشل لاء حکام نے، معاشرتی اصلاح کے لئے بہت کچھ سوچا اور کچھ اقدامات بھی کئے۔ لیکن دنیا حیران تھی کہ ملک کے (خود ساختہ) لیڈر جو ایسے حالات پیدا کرنے کے ذمہ دار تھے جن کی وجہ سے مارشل لاء جیسا سخت قدم اٹھانا پڑا، ان کے خلاف کچھ بھی نہ کیا گیا۔ لیکن آخر الامر عسکری نظام نے ایک ایسا قدم اٹھایا ہے جس سے ان لیڈروں کو ایسی عبرت ناک سزا ملی ہے کہ یہ خود تو ایک طرف، ان کی آنے والی نسلیں بھی یاد کریں گی ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ قدم اس سزا دینے کے لئے اٹھایا گیا ہے لیکن اس کا نتیجہ بہر حال یہی برآمد ہوا ہے وہ قدم ہے صدر یحییٰ خان کا یہ فیصلہ کہ یکم جنوری سے سیاسی سرگرمیوں کی عام آزادی ہو گی۔ اس سے یوں نظر آیا جیسے (مودودی صاحب کی کسی زمانے کی تشبیہ کے مطابق) چڑیا گھر کے جانوروں کے پنجرے کھل گئے ہیں اور وہ باہر نکل کر باہم گرگتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ اس فیصلہ کے بعد یہ لوگ اس طرح ننگے ہوتے ہیں کہ مصلحت کوشیوں کا دبیز سے دبیز پردہ بھی ان کا ستر نہیں ڈھانپ سکا۔ ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی، دشنام دہی طعن و تشنیع، طنز و طعن۔ ہفوات و مکذوبات، (سچے جھوٹے) راز ہائے درونِ خانہ کی پردہ دری، انداز سوقیانہ، اسلوب مبتذل، زبان بازاری، حرکات و سکنات میں شہدپن۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عفریتی رقص کے ایسے شرمناک مظاہرے جس سے حیا کی آنکھیں جھک جائیں اور شرافت سرنگوں ہو جائے۔ ان کی جو حالت ہے سو ہے، ہمیں تو یہ احساس کھائے جا رہا ہے کہ دنیا ملتِ پاکستانیہ کے متعلق کیا خیال کرے گی؟ ان کی اس برہنگی نے، قوم کو سر اٹھانے کے قابل نہیں رہنے دیا۔ لیڈروں کی یہ حالت ہے اور ہماری صحافت، لکھنؤ کی بھٹیاریوں کو بھی مات کر گئی ہے۔ یہ اس سطح پر آ گئی ہے کہ (مثلاً) ایک لیڈر کے متعلق یوں خامہ فرسائی ہوتی ہے۔

اس وقت ان کی پکچر عوام میں ہٹ ہو سکی ہے تو اس کی وجہ پکچر کا معیاری ہونا نہیں

> بلکہ اولاً ملک کے نوجوانوں کا عمومی مذاق ہے کہ سیاسیات میں بھی وہ راہ نماؤں کی بہ نسبت اداکاروں کو چاہتے ہیں۔ اس عمر میں مفکروں کے مقابلہ میں مسخروں سے زیادہ لگاؤ رہتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہی پکچر عوام میں فی الفور مقبول ہوتی ہے جس کے اداکار چلبلے، مکالمے عمومی اور گانے شہوانی ہوں۔ . . . . صاحب کی پکچر جس کے وہ چیف ایکٹر ہیں، ایسی ہی پکچر ہے۔ ظاہر ہے کہ براندی کا پیگ لگا کر اسٹیج پر تھرکنا، مٹکنا اور بھاؤ بتانا ان سیاست والوں کو نہیں آتا جن پر . . . . بزعم خویش . . . . کی پھبتی کستے ہیں۔ اس فن میں . . . . ہی اتارو ہیں۔ وہ سیاسیات میں بلاشبہ گرو یا تاجارو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب صحافت کی زبان یہ ہو جائے اور لیڈروں کی حرکات و سکنات وہ، تو عوام جس سطح پر آتر آئیں گے وہ ظاہر ہے۔ ابھی اس "آزادی" کو قریب دو ہفتہ کا عرصہ گزرا ہے اور اس قسم کی خبریں آنی شروع ہو گئی ہیں کہ فلاں جلسہ میں نوبت دھینگا مشتی تک پہنچ گئی ہے۔ کہیں مکا دکھایا گیا کہیں ڈنڈا اٹھایا گیا۔ ایک طرف سے آواز آئی کہ میں ایک گھونسے کے جواب میں دس گھونسے رسید کروں گا۔ اس "مادر پدر آزادی" کا انجام کیا ہوگا، اس کے تصور سے روح لرزتی ہے، جسم پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے اور بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے کہ۔ یلیتنی مت قبل ھذا و کنت نسیا منسیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ آزادی کی یہ ہنڈیا ان ایک سو بیس دنوں میں پھوٹے گی جب یہ حضرات دستور مرتب کرنے بیٹھیں گے۔ لیکن اب نظر آتا ہے کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو اس سے بہت پہلے کشت و خون تک کی نوبت آجائے گی اور بات الیکشن تک پہنچے گی ہی نہیں۔ حیرت ہے کہ ملک میں کوئی ایک "رجلِ رشید" بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ان حواس باختہ مدہوشوں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرے۔ اس سے بڑھ کر کسی قوم کی سوختہ بختی اور کیا ہو سکتی ہے! غالب نے اپنی حرماں نصیبی کا رونا ان الفاظ میں رویا تھا کہ

هوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

ناخدائے خفتہ کو تو جگایا جا سکتا ہے۔ لیکن جس کشتی کے ناخدا ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر، پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگ جائیں، اس کشتی کو کون بچا سکتا ہے؟

لیکن زمانے کے انداز بتاتے ہیں کہ بادل چھٹیں گے، طوفان تھمے گا، پاگلوں کا دور ختم ہو جائے گا، سپردانشِ برہانی و نورانی کی فرماں روائی ہوگی و اشرقت الارض بنور ربھا۔ زمین اپنے

نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ یہی تو غالب ہی نے کہا تھا کہ

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

(۱)

(۲)

صدر مملکت نے ون یونٹ توڑنے کا فیصلہ کر دیا اور اسے انعقادِ انتخابات کے لئے تدبیر لاینفک قرار دے دیا۔ لہٰذا اس مسئلہ پر کوئی گفتگو کی جا سکتی ہے اور نہ ہی اسے ازسرِنو موضوعِ بحث بنایا جا سکتا ہے لیکن اس سلسلہ میں ایک اور سوال سامنے آتا ہے جو ہنوز فیصلہ طلب ہے۔ یہ سوال ایسا اہم ہے کہ ہمارے نزدیک (ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد) پاکستان کی سالمیت اور وحدت ہی نہیں' بلکہ اس کے عدم و وجود کا دار و مدار اسی پر ہے۔ لہٰذا' ہم اس مسئلہ کے متعلق ذرا کھل کر بات کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

یک گریہ پس از ضبطِ دو صد گریہ رضا دہ
تا تلخیٔ آں زہر تو انم ز گلو بُرد

کسی مملکت کی سالمیت' استحکام اور بقا کا راز اس کے مرکز کی محکمیت میں ہوتا ہے جس قدر مرکز مضبوط ہوگا' اسی قدر وہ مملکت محکم' اور خطرات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوگی۔ قرآن کریم نے "کعبہ" کو ملتِ اسلامیہ کا مرکزِ محسوس قرار دیا تھا۔ (ان کے نظریات کا مرکز قرآن' اور اطاعت کا مرکز نظام ہے) اس نے امت کی اس مرکزیت کو کس قدر اہمیت دی تھی اس کا اندازہ اس کے اس حکم سے لگائیے جس میں اس نے کہا تھا کہ ـــ وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَهٗ۔ (۲/۱۴۴)۔ تم جہاں کہیں بھی ہو' اپنی توجہات کو اس مرکز کی طرف مرکوز رکھو ـــ ایک مرکز' اور افرادِ امت کہیں بھی ہوں' ان کی نگاہیں اسی پر مرتکز ـــ یہی اس امت کی خصوصیت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ
نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

ہماری تاریخ میں "خلافت" کو یہی مقام حاصل رہا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اس مرکزِ امت کی ہمہ گیریت اور جامعیت کی جو کیفیت تھی اس کی تو کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ اس کے بعد جب دورِ ملوکیت آ گیا تو پھر بھی اس کی اہمیت یکسر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ چنانچہ مسلمانوں کی جو حکومتیں ہند و ایران و تاتار میں قائم ہوتی تھیں وہ بھی خطبہ میں خلیفۂ بغداد ہی کا نام لیتی تھیں ـــ

وحدتِ امت کے لئے مرکز کی حکمیت کا یہ نظریہ درحقیقت وحدتِ انسانیت کے لئے طائرِ پیش رس کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہم نے تو اس نکتہ کو فراموش کر دیا لیکن باقی دنیا اب چاروں طرف سے ہار تھک کر اسی نظمِ اجتماعی کی طرف آ رہی ہے جس کی رو سے وہ چاہتی ہے کہ روئے زمین کے تمام انسان ایک ہی نظام کے تابع زندگی بسر کریں اور ان کا مرکز ایک ہی ہو۔ سویڈن کا ماہر معاشیات (GUNNER MYRDAL) اپنی کتاب (BEYOND WELFARE STATE) میں لکھتا ہے۔

> یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آ جائے جس میں نہ کرۂ ارض کے نقشہ پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرت کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی اس قسم کی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔

کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ اسقف (TEILHARD - DE - CHARDIN) — جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا — اپنی کتاب (BUILDING THE EARTH) میں لکھتا ہے۔

> اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کر دیں اور مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستیوں سے اچھال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے وحدتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن، اور نسل کی تنگ نائیوں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسانی کو اپنے آغوش میں سمیٹ لے۔

ہم نے پاکستان کا خطۂ زمین اسی مقصد کے لئے حاصل کیا تھا کہ قرآن کے اس تصور وحدتِ انسانیت کو جسے ہم نے فراموش کر دیا تھا لیکن جس کی طرف اب دنیا طوعاً و کرہاً آ رہی ہے، ایک عملی نظام کی شکل میں

سامنے لائیں۔ ہمارا نصب العین یہ تھا کہ اس میں ہم ایک ایسی مملکت کی تشکیل کریں جو رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر خالص آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک پر مبنی ہو۔ لیکن ہم نے ایسی الٹی زقند لگائی کہ اس قسم کا قرآنی معاشرہ متشکل ہونا تو درکنار، خود مملکت کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ ذرا مجیب الرحمٰن صاحب کے چھ نکات کو سامنے لائیے اور سوچئے کہ پاکستان کا کوئی بہی خواہ اس قسم کی تباہ کن اسکیم کا تصور بھی کر سکتا ہے، کوئی پاکستانی ایک طرف، ہم یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہیں کہ اگر آج (بفرض محال) ہندوستان جیسا کھلا ہوا دشمن بھی ہم سے کانفیڈریسی کا معاہدہ کرنے کی تجویز پیش کرے تو اس قسم کی شرائط عاید کرنے کی وہ کبھی جرأت نہ کرے گا۔ مجیب صاحب کی اسکیم کا ملخص یہ ہے کہ مشرقی پاکستان (جسے اب وہ بنگلہ دیش کہہ کر پکارتے ہیں) اور مغربی پاکستان دو کاملاً خود مختار مملکتیں ہوں جن کے باہمی تعلقات کے لئے ایک فیڈرل سنٹر رکھا جائے۔ اس سنٹر (مرکز) کی تحویل میں صرف دفاع اور امور خارجہ کے شعبے ہوں۔ لیکن اُسے ملک میں ٹیکس لگانے کی اجازت نہ ہو۔ وہ اپنے اخراجات ان دونوں آزاد مملکتوں کے عطیات سے پورے کرے۔ (اگر یہ مملکتیں عطیات کی بخشش نہ کریں۔ ان میں کمی کر دیں یا بروقت ادائیگی نہ کریں تو پھر یہ بے چارہ گداگری کیا کرے؟) دفاع کے سلسلہ میں بھی اندرونی حفاظت کے لئے ان ہر دو مملکتوں کے پاس اپنی اپنی علاقائی فوج ہو یعنی ملک میں تین فوجیں ہوں! جہاں تک امور خارجہ کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں بین المملکتی تعلقات کا بیشتر مدار تجارت پر ہوتا ہے۔ پاکستان کی یہ دونوں آزاد مملکتیں دوسری مملکتوں کے ساتھ تجارت براہِ راست کر سکیں گی اور اس مقصد کے لئے ان ممالک میں اپنے نمائندے براہِ راست بھیج سکیں گی۔ آپ سوچئے کہ اس فقیر بے نوا (سنٹر) کے پاس کون سی وجہ کشش ہوگی جس کے لئے دیگر مملکتیں اس سے تعلقات وابستہ رکھنے کی ضرورت محسوس کریں گی؟ غور فرمائیے کہ اس اسکیم کے مطابق مملکت پاکستان کا وجود بھی باقی رہ سکیگا؟ اور کیا کوئی شخص جس کے دل میں پاکستان کے لئے ذرا سا بھی جذبۂ بہی خواہی ہو وہ ان خطوط پر سوچنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ کیا مملکت سے غداری کی اس سے بدتر شکل کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ اور تماشہ یہ کہ مجیب صاحب اس قسم کی آزاد مملکت صرف مشرقی پاکستان ہی میں قائم نہیں کرنا چاہتے، وہ مغربی پاکستان کے بھی واحد نمائندہ بن رہے ہیں اور اس پر بھی اپنی اسکیم مسلط کرنا چاہتے ہیں۔

اب آئیے مغربی پاکستان کی طرف۔ یہاں کے لیڈر صاحبان علاقائی خود مختاری کے باب میں پہلی جست میں مجیب صاحب تک تو نہیں جاتے لیکن جہاں تک یہ جانا چاہتے ہیں وہ بھی مملکت پاکستانیہ کے لئے کچھ کم خطرہ کا موجب نہیں۔ ان کے مطالبات کی مشترک اقدار یہ ہیں کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو خود مختاری حاصل ہو اور دفاع، خارجی تعلقات، کرنسی، وفاقی مالیات، تجارت اور مواصلات مرکز کے پاس

رہیں۔ لیکن آپ ذرا اس پوزیشن کو سامنے لائیے کہ ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد مغربی پاکستان میں چار پانچ صوبجاتی حکومتیں قائم ہوں گی۔ اب اگر مجیب صاحب اکثریت کے ساتھ اسمبلی میں آجائیں اور اپنی اسکیم منظور کرالیں تو کیا مغربی پاکستان میں بھی چار پانچ کامل خود مختار ریاستیں قائم نہیں ہو جائیں گی؟ اور اگر مجیب صاحب کی اسکیم بتمامہ نہ بھی منظور ہو تو یہ تو ظاہر ہے کہ جس قدر آزادی مشرقی پاکستان کو دی جائے گی اسی قدر آزادی مغربی پاکستان کی ان چار پانچ ریاستوں کو بھی دینی پڑے گی۔ آپ سوچئے کہ جس مملکت کے دشمن اس کی موجودہ شکل میں بھی اس پر جھپٹنے کے لئے پر تول رہے ہیں، جب وہ اتنے ٹکڑوں میں بٹ جائے گی تو ان کے لئے اسے اُچک کر لیجانے میں کون سا امر مانع ہوگا؟

یہ ہیں اس وقت ملک کے لیڈروں اور ان کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے عزائم۔ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اسلام پر ایمان رکھتا ہے اور یہاں (اپنے اپنے تصور کے مطابق) اسلامی نظام قائم کرنے کا مدعی ہے۔ اسلام کے متعلق ان کے تصورات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ہم ان کے سامنے، قرآن کریم کی چند ایک نصوص صریحہ لاکر ان سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کی روشنی میں ملک اور قوم میں اس قدر تفرقہ پیدا کر دینے سے اسلام باقی بھی رہ سکتا ہے؟ سورۂ روم میں ہے ...... وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔ ($\frac{30}{31-32}$)۔ مسلمانو! دیکھنا۔ تم مومن ہونے کے بعد پھر سے مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود بھی ایک پارٹی بن کر بیٹھ گئے۔ اس سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر پارٹی اپنے آپ کو حق پر اور دوسروں کو باطل پر سمجھتی ہے۔

یاد رکھیئے! "دین میں تفرقہ" سے مراد مذہبی فرقہ بندی ہی نہیں۔ اس میں ہر قسم کی فرقہ بندی اور پارٹی بازی شامل ہے خواہ وہ مذہبی ہو اور خواہ سیاسی۔ اس لئے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست میں ثنویت نہیں۔ دین، زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے اس لئے تفرقہ میں، مذہبی فرقہ بندی اور سیاسی پارٹی بازی سب شامل ہیں اور مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا تو سب سے بڑا تفرقہ ہے ــــ اور قرآن تفرقہ کو شرک قرار دیتا ہے۔ سو ہم ملک کے مذہبی راہ نماؤں اور سیاسی لیڈروں، دونوں سے پوچھتے ہیں کہ ان کے موجودہ فرقے اور پارٹیاں، اور مملکت کی تفریق و تقسیم کسی طرح بھی جائز قرار پاتی ہے؟

اور آگے بڑھیئے۔ سورۂ آل عمران میں ہے ــــ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۔ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ ($\frac{3}{104}$)

سلمانو! دیکھنا۔ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (قرآن کی) واضح تعلیم آ جانے کے بعد باہمی تفرقہ پیدا کر لیا اور آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ ایسے لوگ خدا کے عذابِ عظیم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یہ فرقے کیوں بنتے ہیں۔ یہ پارٹیاں کیوں وجود میں آتی ہیں۔ یہ باہمی افتراق اور اختلاف کیوں پیدا ہوتا ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ اس کی وجہ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۴) ہے۔ ہر پارٹی دوسری پارٹی سے آگے نکل جانا اور اس پر غلبہ پا لینا چاہتی ہے۔

جو لوگ امت میں تفرقہ پیدا کریں، ان کے متعلق حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ۔ (۶/۱۵۹)

جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور خود ایک پارٹی بن بیٹھیں اے رسول! تیرا اُن سے کوئی واسطہ نہیں۔

آپ سوچئے کہ امت میں تفرقہ پیدا کرنا اور فرقے اور پارٹیاں بنا لینا (اور مملکتِ اسلامیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا) خدا کے ساتھ شرک ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس کے بعد آپ پوچھئے ان اقامتِ دین کے داعیوں، اسلام کے علمبرداروں اور اسلامی مملکت کے قیام کے دعویداروں سے، کہ ان کی موجودہ روش کس اسلام کی رُو سے جائز قرار پاتی ہے اور مرکز کو اس قدر کمزور کر کے مملکت کے چھوٹے چھوٹے کر دینا کون سے دین کے فروغ کے لئے ہے؟ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس اصول کے ماتحت کیا کہ قرآن کی رُو سے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ (قوم اور مملکت) کی تشکیل اشتراکِ ایمان کی رُو سے ہوتی ہے نہ کہ نسل، رنگ، زبان، جغرافیائی حدود کے معیار پر۔ ہم نے پاکستان کو حاصل اس قرآنی اصول کی رُو سے کیا۔ آپ فرمائیے کہ یہ جو تقسیمِ پاکستان اور تفریقِ ملت کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں تو اس کی بنیاد کیا ہے؟ بنگالی، بلوچی، سندھی، پنجابی، پٹھان کی تفریق و تمیز! سوچئے کہ کیا یہ تفریق پھر سے جاہلیت قبل از اسلام کے تصورِ قومیت کی طرف دعوت نہیں؟ یہ اسلام کے بعد پھر سے کفر کی طرف لوٹ جانے کے مرادف نہیں؟ اس کے بعد غور کیجئے کہ کیا وہ ہم ہی ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ۔ تم ہی کہو کہ اس قوم پر فلاح و بہبود کی راہیں کس طرح کشادہ ہو سکتی ہیں جو ایمان لانے کے بعد پھر سے حالتِ کفر کی طرف لوٹ جائے۔ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ۔ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ۔ حالانکہ خدا کا واضح ضابطۂ ہدایت بھی ان کے پاس ہو اور وہ اس امر کی شہادت بھی دے رہے ہوں کہ ان کا رسول ہی

حقیقت کا علمبردار تھا۔ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ - (۶۲:۵) اسے اچھی طرح سن رکھو کہ جو قوم اس طرح اپنے آپ پر ظلم کرنے لگ جائے، خدا اسے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔ ہم نے معیارِ قومیت اور تشکیلِ مملکت کا یہ "دنیا جہان سے انوکھا" دعویٰ کیا اور دنیا نے ہمیں تعجب کی نگاہوں سے دیکھا۔ ان کا تبسم زیرلب ان کے اس احساس کا غماز تھا کہ وہ اس اصول کو ناممکن العمل اور اساطیر الاولین سمجھ رہے ہیں۔ وہ اسے "دیوانے کا خواب" قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ تقسیم ہند کے اعلان کے ساتھ ہی، ہندو اور انگریز دونوں نے بیک زبان اور علی الاعلان کہہ دیا کہ جناح نے محض اپنی ضد پوری کی ہے۔ یہ بیل منڈھے چڑھ ہی نہیں سکتی۔ نہ کبھی قومیں اس معیار کے مطابق وجود پذیر ہوتی ہیں، نہ مملکتوں کی عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ یہ چند دن کا کھیل ہے۔ اس کے بعد یہ خود اس اصول کو چھوڑ دینگے اور پلٹ کر ہمیں آ جائیں گے۔ حتیٰ کہ ابوالکلام آزاد نے (اپنی بعد از مرگ شائع شدہ سرنوشت میں) یہاں تک لکھ دیا کہ اسلام نے رنگ، نسل اور جغرافیائی حدود کے علی الرغم محض اشتراکِ ایمان کی بنیادوں پر تشکیلِ مملکت اور تقویمِ ملت کا ایک تجربہ کیا تھا جو چند ہی سالوں کے بعد ناکام ثابت ہو گیا۔ اب اسی ناکام تجربہ کو اپنے دعوے کی بنیاد قرار دینا فریب دہی (FRAUD) ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ہم اپنی موجودہ حرکات سے یہی نہیں ثابت کر رہے کہ (معاذ اللہ) اسلام کا دعویٰ باطل تھا۔ یہ چل سکنے کے قابل ہے ہی نہیں اور کیا اس کے بعد بھارت (اور اس کی ہمنوا قومیں) یہ نہیں کہیں گی کہ جب مطالبۂ پاکستان کا دعویٰ ہی باطل اور تشکیلِ مملکت کا یہ اصول ہی ناممکن العمل تھا، تو پھر تقسیم ہند کو باقی رکھنے کے معنی کیا ہیں؟ ہم نے طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ ہماری سابقہ حکومتوں نے سخت غلطی کی کہ ملک کے مختلف حصوں میں بسنے والی ملتِ پاکستانیہ کے افراد کے دلوں کو آپس میں جوڑنے کے لئے کچھ نہ کیا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ وہ باہمی مغائرت جو انگریز کی حکمتِ فرعونی نے پیدا کی تھی اور جسے ہندو کی کوٹلیائی سیاست نے ہوا دی تھی، نہ صرف باقی رہی بلکہ باہمی مفاد کے تصادم سے شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اب "بہی خواہانِ ملت" اور "غمگسارانِ مملکت" نے (بجائے اس کے کہ وہ اس مغائرت کو دور کرنے کی تدابیر سوچیں) اس کا علاج یہ سوچا ہے کہ یہ سب الگ الگ قوموں کی حیثیت سے رہیں اور جداگانہ مملکتوں کے مالک بنا دیئے جائیں۔ یعنی ان طبیبانِ مشفق کے نزدیک سردرد کا علاج یہ ہے کہ سر کو کاٹ کر جسم سے الگ کر دیا جائے۔ اس "علاج" کا نتیجہ ہے کہ ابھی ون یونٹ قائم ہے اور مختلف صوبوں کو خود مختاری حاصل نہیں ہوئی، لیکن وہاں کے رہنے والوں کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور عداوت کی آگ سلگنی شروع ہو گئی ہے اور شدہ شدہ جو اطلاعات موصول ہو رہی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ ان علاقوں کے "اصلی باشندے" دوسروں کو انہی نظروں

سے دیکھنے لگ گئے ہیں جن نگاہوں سے ہندوستان کا ہندو، وہاں کے مسلمانوں کو دیکھتا ہے۔ کیا یہ چیز وجہِ صد حیرت نہیں کہ اِن علاقوں کے مسلمانوں نے وہاں بسنے والے ہندوؤں کو نہ صرف برداشت کیا ہے بلکہ ان کے ساتھ اِن کے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں۔ لیکن اپنی علاقوں میں بسنے والے "باہر کے مسلمانوں" کو مداخلتِ بیجا (TRESS - PASSING) کے جرم کے مرتکب تصور کرنے لگ گئے ہیں! ہم جانتے ہیں کہ ان علاقوں کے عوام کے دلوں میں نفرت اور مغائرت کے یہ جذبات از خود موجود نہیں تھے۔ انہیں وہاں کے لیڈر صاحبان بیدار کر رہے اور ہوا دے رہے ہیں کیونکہ علاقائی خود مختاری کے ساتھ ان کے مفاد وابستہ ہیں۔ یہ صرف اپنے ذاتی اور عارضی مفادات کی خاطر، قوم کے ٹکڑے ٹکڑے اور مملکت کے حصے بخرے کرنے کے درپے ہیں ـــــ قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند ـــــ تشکیلِ پاکستان سے مقصد یہ تھا کہ ہم (قرآن کے بنیادی اصولِ قومیت کی بنا پر) ایک مثالی مملکت قائم کر کے، پورے عالم اسلام کو پھر سے امتِ واحدہ بنانے کی طرف قدم بڑھاتے۔ لیکن وائے افسوس! کہ ہماری یہ مقدس آرزو، دشمنوں کی نگاہوں میں کانٹا بنکر کھٹکنے لگ گئیں اور عالمِ اسلام کو امتِ واحدہ بناتے بناتے ہم خود ہی تفرقہ و اختلافات کا شکار ہو گئے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، ون یونٹ کے مسئلہ کو از سرِ نو اٹھایا نہیں جا سکتا نہ ہی اسے اِس وقت اٹھانا چاہیئے۔ لیکن ان صوبوں کو کس حد تک خود مختار قرار دیا جائے، یہ سوال زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے ملک کے جس قدر لیڈر اس وقت باٹا بانٹی کے لئے رقصِ عفریتی میں مصروف ہیں، ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ ملت اور مملکت کے مفاد کو، اپنے مفادات پر ترجیح دے کر، اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔ اس وقت ہر ایک کی کوشش یہ ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل ہوں، اور ووٹ حاصل کرنے کے لئے اُدھر کو چلنا پڑتا ہے جدھر کی ہوا ہو۔ ہواؤں کا رُخ بدلنے کا سوال ان کے سامنے آ ہی نہیں سکتا۔ لیکن اگر ملک کے کسی گوشے میں ایسے حضرات موجود ہیں جو پاکستان (اور اسلام) کے مفاد کو، دیگر مفادات اور رجحانات پر ترجیح دینے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں، تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ اس سوال کو لے کر آگے بڑھیں اور اس تصور کے حامل ارکان کو ساتھ لے کر آئین ساز اسمبلی میں جائیں۔ یہ سوال وہاں زیرِ بحث آئے گا۔ ہمارے نزدیک، مملکت اور ملت کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ مرکز زیادہ سے زیادہ مضبوط رہے اور صوبوں کی حیثیت کچھ ایسی ہی ہو جیسے ایک صوبہ میں کمشنریاں ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کے لئے عملی پروگرام بنایا جائے کہ انتظامی امور میں عوام کو جو مشکلات اور پریشانیاں پیش آ رہی تھیں، ان کا ازالہ کیا جائے اور مملکت کے ثمرات سے ہر فردِ مملکت، بلا تمیز و تخصیص، یکساں طور پر بہرہ یاب ہوتا رہے۔

نیز ابلاغ و تبلیغ اور تعلیم و تربیت سے ایسی فضا پیدا کی جائے جس سے رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی حدود کے امتیازات ختم ہوتے جائیں اور ہم ایک امت کے افراد، اور ایک مملکت کے ارکان بن جائیں ۔۔۔ یعنی، اقبالؔ کے الفاظ میں، ہم شرمندگانِ ساحل، پھر سے اچھل کر بے کراں ہو جائیں ۔۔۔ اور اس طرح دنیا کو بتا دیں کہ قرآن کا یہ اصول کہ انسانیت کی حقیقی اور پائدار وجۂ جامعیت، آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے، نہ کوئی ناکام تجربہ ہے اور نہ ہی چلا ہوا کارتوس ۔ یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور انسانی مشکلات کا واحد حل ۔۔۔ لیکن اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اس اصول کا کچھ نہیں بگڑے گا، ہم خود ہی اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے ۔ قرآن کے اصول ابدی حقائق ہیں ۔ دنیا، اپنے ناکام تجارب کے بعد، خود بخود ان کی طرف آ رہی ہے ۔ ہم اس سے انحراف برتنا چاہیں تو یہ ہماری سوختہ بختی کی دلیل ہوگی ۔ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ ۔

(محررہ ۱۶ جنوری)

طلوعِ اسلام کے آئندہ شمارہ میں

قرآنی منشور

پیش کیا جائیگا!

جو اسلامی مملکت کے آئین کی بنیاد ہوتا ہے ——— قارئین انتظار فرمائیں!

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں محترم پرویز صاحب کا درس قرآن کریم ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے ۲۵/بی گلبرگ میں ہوتا ہے ۔

(خواتین کے لئے پردہ کا انتظام ہوتا ہے!)

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

طلوعِ اسلام کالج

(بتسلسل فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام۔ بابت جنوری ۱۹۷۰ء)

فہرست (الف)

مندرجہ ذیل حضرات سے وسط دسمبر سے وسط جنوری تک عطیات عنایت فرمائے۔

(۱) محترم احسان الحق صاحب شیخوپورہ۔ -/۲۵۰۰ روپے (۴) محترمہ ڈاکٹر ادیبہ امتیاز صاحبہ۔ لاہور -/۱۵۰۰ (مزید)
(۲) محترم انعام الحق صاحب شیخوپورہ -/۲۵۰۰ روپے (۵) محترمہ نجمہ فواد صاحبہ۔ لاہور -/۱۵۰۰ (")
(۳) محترمہ یاسمین آفتاب صاحبہ۔ لاہور -/۱۵۰۰ (مزید) (۶) محترمہ مسز رشیدہ عبداللہ صاحبہ کراچی۔ -/۲۵۰۰ روپے

فہرست (ب)

مندرجہ ذیل عطیات بزمِ طلوعِ اسلام بریڈفورڈ۔ انگلستان کی معرفت دسمبر کے آخری ہفتہ میں وصول ہوئے جبکہ جنوری کا پرچہ پریس میں جا چکا تھا۔

(۱) محترم محبوب احمد نقوی صاحب۔ شیفلی ۳۹/۵۴ روپے (۵) محترم محمد اسلم بیگ صاحب۔ لیڈز ۲۹۶/۵۵ روپے
(۲) محترم نثار احمد صاحب طالب علم آسٹریا۔ ۱۹/۷۷ " (۶) محترم محمد یوسف بٹ صاحب آکسفورڈ ۱۹۷/۷۰ "
(۳) محترم محمد فاضل صاحب۔ ڈڈلی ۹۸/۸۵ " (۷) محترم عبدالخالق نظامی صاحب۔ بریڈفورڈ ۱۹/۷۷ "
(۴) محترم رشید احمد بٹ صاحب۔ بریڈفورڈ ۳۹۵/۴۰ " (۸) محترم عین الحق صاحب۔ بریڈفورڈ ۳۹/۵۴ "

[1] محترم رشید احمد بٹ صاحب اس سے قبل مبلغ -/۴۰۰ روپے نقد کالج فنڈ میں دے چکے ہیں۔

مندرجہ ذیل عطیات بزمِ طلوعِ اسلام بریڈفورڈ کی معرفت ماہ جنوری میں وصول ہوئے۔

(۱) محترم محمد اشرف صاحب۔ بریڈفورڈ ۳۸/۳۳ روپے
(۲) محترم ڈاکٹر محمد طاہر قریشی صاحب۔ بریڈفورڈ ۱۹۱/۶۵ روپے
(۳) محترم ڈاکٹر منیر صاحب۔ بریڈفورڈ ۳۸/۳۳ روپے
(۴) محترم محمد رشید گوندل صاحب۔ بریڈفورڈ ۳۸/۳۳ روپے
(۵) محترم یار احمد خان صاحب بریڈفورڈ ۹۵/۸۲ روپے
(۶) محترم راجہ غلام مصطفےٰ صاحب برمنگھم ۹۵/۸۲ روپے

(۷)	محترم سلمان صاحب۔	برمنگھم	۲۸۷/۴۷ روپے
(۸)	محترم محمد صادق قاضی صاحب۔	چارلی	۷۶/۴۴ روپے
(۹)	محترم محمد طفیل صاحب۔	پیرس	۱۹۱/۶۵ روپے
(۱۰)	محترم ایم۔ایم فرحت صاحب۔	لندن	۱۹۱/۶۵ روپے
(۱۱)	محترم نصیر احمد قریشی صاحب	بریڈفورڈ	۹/۵۸ روپے
(۱۲)	محترم یعقوب احمد نقوی صاحب۔	کیشلی	۲۰/۱۴ روپے
(۱۳)	محترم محمود احمد نقوی صاحب۔	کیشلی	۵/۰۳ روپے
(۱۴)	محترم دین محمد صاحب۔	بریڈفورڈ	۱۹۱/۶۵ روپے
(۱۵)	محترم وزیر احمد صاحب۔	بریڈفورڈ	۳۸/۳۳ روپے
(۱۶)	محترم محمد یوسف بٹ صاحب۔	آکسفورڈ	۹۵/۸۲ روپے
(۱۷)	محترم علی احمد شاہ صاحب	بریڈفورڈ	۱۹/۱۶ روپے
(۱۸)	محترم بشارت احمد میر صاحب	لندن	۳۸۳/۳۰ روپے

مندرجہ ذیل عطیات مقامی حضرات سے وصول ہوئے :-

(۱)	محترم مشتاق احمد صاحب۔ پن سٹاک انجنیئرنگ کمپنی۔ کراچی	۵۰۰/- روپے
(۲)	محترم محمد زمان صاحب۔ پی۔اے۔ ایف۔ بدین	۱۰۰/- روپے
(۳)	محترم حکیم محمد حسین صاحب۔ سول لائنز۔ گجرات	۵۰۰/- روپے
(۴)	محترم منصور الحق صاحب۔	۷۵/- روپے
(۵)	محترم چوہدری اکبر علی بھنگو صاحب۔ ساکن علی پور۔ چک ۳۶	۱۰۰/- روپے
(۶)	محترم چوہدری صدر الدین صاحب چک ۷۰ گ۔ب۔ سمندری	۵۰/- روپے
(۷)	محترم محمد حسین صاحب۔ نمائندہ بزم طلوع اسلام۔ گھوٹکی۔	۵۰/- روپے
(۸)	محترم محمد اسمٰعیل صاحب۔ نیشنل کلاتھ سٹور۔ لائلپور	۳/- روپے

مندرجہ ذیل عطیہ فہرست اوّل میں سہواً درج ہونے سے رہ گیا تھا۔

(۹)	عزیزہ نوشابہ۔	۳۰/- روپے

(یہ رقم محترم این۔ اے خانصاحب نے کنونشن کے موقع پر عزیزہ نوشابہ کی تقریر پر بطور انعام دی تھی اور عزیزہ نے اُسے کالج فنڈ میں جمع کرا دیا تھا۔)

سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

بصیرت افروز حقیقت کشا انقلاب آفریں کتابیں

۱۔ شعلۂ مستور حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا یہود نے آپ کو واقعی فروخت کر دیا تھا؟ کیا آپ آسمانوں پر زندہ ہیں؟ کیا آپ پھر نازل ہوں گے؟ آپ کی صحیح تعلیم کیا تھی؟ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے

۲۔ نظامِ ربوبیت نظامِ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے۔ اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملیگی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت۔ چار روپے

۳۔ خدا اور سرمایہ دار موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصرِ معاشیات کہلاتا ہے ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے انکا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ قیمت۔ قسم اعلیٰ مجلد۔ نو روپے۔ قسم دوم۔ پانچ روپے

۴۔ اسلام پر کیا گزری؟ از علامہ احمد امین مصری۔ اسلام کیا تھا اور اس کے بعد کیا ہو گیا اور کیسے ہوا۔ اسلام میں غیر اسلامی تصورات و معتقدات، رسوم، مناسک کہاں سے آ گئے۔ قیمت پانچ روپے

۵۔ الفتنۃ الکبریٰ از ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری۔ حضور رسالتمآبؐ کی رحلت کے پچیس سال بعد ہی امیر المومنین حضرت عثمانؓ کس طرح دن دہاڑے شہید کر دیئے گئے اور امت مسلمہ کو کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ اس صورتِ حال کے محرکات کیا تھے اور اس کا پس منظر کیا تھا۔ تاریخ میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ قیمت چھ روپے

۶۔ دھتکارے ہوئے انسان از عنایت اللہ۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے کی دنیا کے پُراسرار حالات۔ قاتلوں۔ ڈاکوؤں۔ گرہ کٹوں اور سنگین مجرموں کے جرائم کا پس منظر۔ جیل میں بسنے والی دنیا کے عجیب، وحشتناک، حیرت انگیز، لیکن عبرت آموز حالات جو طلسم ہوش ربا سے زیادہ دلچسپ اور گلستانِ سعدی سے زیادہ سبق آموز ہیں۔ قیمت مجلد ۵ روپے

۷۔ فردوسِ گم گشتہ محترم پرویز صاحب کے ان مضامین اور تقاریر کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا ہے۔ خالص ادبی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اردو زبان کی بہت کم کتابیں اس پایہ کی دکھائی دیں گی۔ قیمت آٹھ روپے

۸۔ سلسبیل قرآنی بصیرت کا چشمۂ رواں یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ قیمت۔ آٹھ روپے۔

۹۔ **بہارِ نو** | یہ مقالات کے مجموعہ کا دوسرا حصہ ہے جس سے ذہن میں جلا پیدا ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ سستا ایڈیشن۔ قیمت پانچ روپے

۱۰۔ **تاریخ الامت** | از علامہ اسلم جیراجپوری۔ آٹھ حصے۔ امت کی تمام سرگذشت بیک وقت آپ کے سامنے آ جائے گی۔ قیمت جلد اول ۲/۵۰ روپے۔ جلد دوم ۲/۵۰ روپے۔ جلد سوم ۲/- روپے جلد چہارم ۲/۵۰ روپے جلد پنجم ۳/- روپے۔ جلد ششم ۲/۵۰ روپے۔ جلد ہفتم ۲/- روپے۔ جلد ہشتم ۲/۵۰ روپے۔

۱۱۔ **اقبالؒ اور قرآن** | علامہ اقبالؒ کی فکر کا سرچشمہ قرآن ہے۔ یہ دعویٰ تو آپ نے اکثر سنا ہوگا لیکن اس کا ثبوت بہت کم ملا ہوگا۔ دیکھئے کہ اقبال اور قرآن دونوں پر نگاہ رکھنے والے پرویز صاحب نے اسکے متعلق کیا لکھا ہے اور کیسے حسین انداز سے لکھا ہے۔ قیمت ۲/- روپے۔

۱۲۔ **قتلِ مرتد۔ غلام اور لونڈیاں** | کیا اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے؟ کیا اسلام قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی اجازت دیتا ہے۔ قرآن کی رو سے ان اہم سوالات کا جواب کیا ہے۔ مدلل اور مسکت بحث۔ اسکی اہمیت اسلئے بھی زیادہ ہے کہ ہمارا قدامت پرست طبقہ مصر ہے کہ جب پاکستان میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا تو اس میں یہی قوانین رائج کئے جائینگے۔ قیمت ۱/۵۰ روپے

۱۳۔ **قرآنی فیصلے** | زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اول ۳/۲۵ روپے۔ جلد دوم ۳/۲۵ روپے۔ جلد سوم ۳/- روپے

۱۴۔ **قرآنی قوانین** | ایک نہایت جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ وکلاء حضرات اور جج صاحبان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ قیمت ۳/- روپے

۱۵۔ **مقامِ حدیث** | وہ کتاب جس نے قرآن کریم اور احادیثِ نبویؐ کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے۔ حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں؟ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے۔ رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے۔ علم حدیث کے متعلق اس ایک کتاب کے اندر اسقدر معلومات ہیں جو آپ کو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دیگی۔ قیمت ۴/- روپے

۱۶۔ **عربی خود سیکھئے** | قرآن کریم کو خود سمجھنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے اسلئے ایک ایسی مختصر اور سلیس سی کتاب کی ضرورت تھی جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جائیں جس سے قرآن کریم آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ یہ کتاب اس مقصد کے لئے نہایت موزوں ہے۔ قیمت ۴/۵۰ روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ **مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور**

جماعتِ اسلامی کے منشور

پر

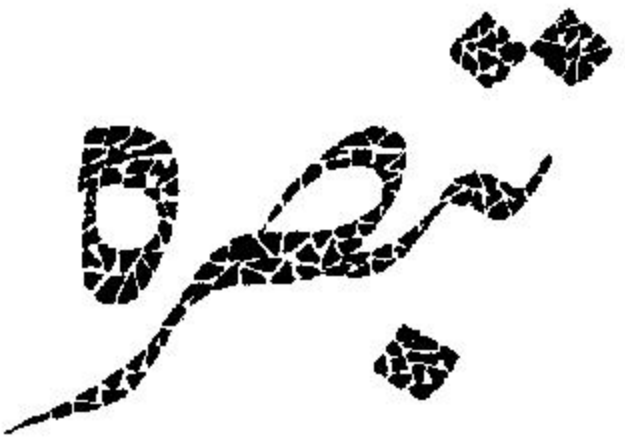

جماعتِ اسلامی کا منشور

اگر تم عوام کو یہ باور کرا دو کہ جو کچھ ان سے کہا جا رہا ہے، وہ مذہب کی رو سے حق ہے یا مذہبی فریضہ ہے، تو تم ان سے جو جی میں آئے کرا سکتے ہو۔ اس میں یہ عوام کسی نظم و ضبط، وفاشعاری، متانت و سنجیدگی اور اخلاقی یا تمدنی احساس کا کوئی پاس نہیں کرینگے۔

یہ الفاظ، فسادات پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں ریکارڈ کئے تھے۔ اور مذہب کی (دین کی نہیں، مذہب کی) ساری تاریخ اس خونچکاں حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ اگر ایک جماعت ایسی ہو

(۱) جس کا مذہب ہر مصلحت کے ساتھ بدلتا رہے۔

(۲) جس کا عقیدہ یہ ہو کہ زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے،

(۳) روپیہ جس کے پاس ہو بے حد و نہایت، اور پراپیگنڈہ کے وسائل بے شمار۔ اور

(۴) سامنے الیکشن کی۔

تو وہ جماعت، مذہب کی آڑ میں کیا کچھ نہیں کرے گی۔ جماعتِ اسلامی کا انتخابی منشور، اسی کتابِ تلبیس کا ابلہ فریب دیباچہ ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ:

(۱) یہ ایک ایسی زنبیلِ عمرو عیار ہے کہ دنیا جہان کی ہر شے اس کے اندر موجود ہے۔ اس منشور کی موجودگی میں کسی دوسری پارٹی کے لئے کوئی الگ بات کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ (ان کے خیال کے مطابق) خارج از اسلام سوشلسٹ جو اپنا انتخابی منشور پیش کریں گے، اس کی بنیادی شقیں بھی اس کے اندر موجود ہیں۔

(۲) اس میں ہر طبقہ کو خوش رکھنے کی کوشش کی گئی ہے — زمیندار کو بھی اور کاشتکار کو بھی — کارخانہ دار کو بھی اور مزدور کو بھی۔ مسٹر کو بھی اور مُلا کو بھی — عوام کو بھی اور خواص کو بھی — اہرمن کو بھی اور یزداں کو بھی۔

(۳) عصرِ حاضر کی میکیاولی سیاست کی تیکنیک یہ ہے کہ بات ہمیشہ مبہم کی جائے — دو ٹوک بات

کبھی نہ کی جائے۔ یہ منشور اس ٹیکنیک کا شاہکار ہے۔ اس میں کوئی بات متعین طور پر نہیں کہی گئی۔ ہمارے لئے یہ تو مشکل ہے کہ ہم اس قدر مبسوط اور ضخیم منشور کی ایک ایک شق کا تجزیہ کر کے حقیقت کو بے نقاب کریں ـــ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ـــ۔ اس لئے اس کی چند ایک نمایاں شقوں کو سامنے لایا جائے گا۔ قارئین انہی چند دانوں سے دیگ کا اندازہ لگا لیں گے۔ ہمارا یہ تبصرہ اخبار ایشیا کی ۲۸ جنوری کی اشاعت میں شائع شدہ بیانات اور منشور پر مبنی ہے۔

ـــــــــــــ (۰) ـــــــــــــ

۱۔ دین اور لادینی کی جنگ

منشور پیش کرتے وقت مودودی صاحب نے ایک پریس کانفرنس میں اپنا بیان پڑھا جس کے شروع میں کہا گیا کہ

> یہ انتخابات ایسی حالت میں منعقد ہونے والے ہیں جب کہ ایک طرف ملک کی اسلامی بنیاد کو اعلانیہ چیلنج کر کے ایک دوسرے نظریہ اور نظام کو اسلام کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا گیا ہے۔

اس کے بعد یہ تو بتکرار و اصرار بتایا گیا ہے کہ ملک کی اس اسلامی بنیاد کی علمبردار اور محافظ جماعتِ اسلامی ہے۔ لیکن اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ کون سا نظریہ اور نظام ہے جسے اسلام کے مقابلہ میں کھڑا کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بنیادی چیز بڑی قابلِ غور ہے۔ اس منشور میں جگہ بہ جگہ کہا گیا ہے کہ یہ بات "شریعت کی رُو سے طے کی جائے گی۔ اس معاملہ کا فیصلہ" اسلام کی رُو سے "کیا جائیگا۔" احکامِ شریعت "کو نافذ کیا جائے گا۔" اسلامی نظام " رائج کیا جائے گا۔ اس حقیقت سے کون بے خبر ہے کہ اس وقت یہ اصطلاحات اس قدر مبہم بن کر رہ گئی ہیں کہ ان کا کوئی واضح مفہوم متعین ہی نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں ایک ہی چیز "ازروئے شریعت" جائز بھی قرار پا جاتی ہے اور ناجائز بھی۔ ایک ہی بات کو ایک گروہ "اسلامی" قرار دیتا ہے اور دوسرا "غیر اسلامی"۔ ایسا طے کرنے کے لئے نہ کوئی متفق علیہ خارجی معیار ہے نہ کوئی ایسی اتھارٹی جو اس کا فیصلہ کر سکے۔ بعینہٖ یہی پوزیشن جماعت اسلامی کے زیرِ نظر منشور میں اختیار کی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مملکت کے جملہ اختیارات انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں کہ جس چیز کو جی چاہا شرعی کہہ کر نافذ کر دیا۔ جسے جی چاہا غیر شرعی کہہ کر مسترد کر دیا۔ (اس سلسلہ میں انہوں نے کس طرح جملہ حقوق بحقِ امیرِ جماعت محفوظ کر رکھے ہیں، اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔)

۲۔ انتخابات کی شرعی حیثیت

مودودی صاحب نے اپنے بیان میں فرمایا کہ

جماعت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئندہ انتخابات میں حصہ لے گی اور مغربی اور مشرقی پاکستان کی تمام نشستوں پر اپنے آدمی کھڑے کریگی۔

اب دیکھئے کہ اس سے پہلے، اسی جماعت کے نزدیک انتخابات کے متعلق شریعت حقہ کا فیصلہ کیا تھا۔ ۱۹۵۱ء کے انتخابات کے زمانے میں ان کا فیصلہ یہ تھا کہ

اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندہ کیا ہے، ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اس بنا پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کریگی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دیگی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے جس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔

(جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد۔ مطبوعہ ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء)

مودودی صاحب کے نزدیک کسی منصب کے لئے بطور امیدوار کھڑا ہونا، اسلام کی رُو سے کس قدر شدید جرم ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (جماعت اسلامی کے مندرجہ بالا فیصلہ کے سلسلہ میں) ایک صاحب نے مودودی صاحب سے پوچھا کہ اگر اسلام کی رُو سے پوزیشن یہ ہے تو حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو خلافت کے لئے بطور امیدوار پیش کیوں کیا تھا؟۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ

آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ یا بزرگان سلف میں کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف،

تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ خدا اور رسول کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانون قرار دیں جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔

(ایضاً)

یہ تھا انتخابات میں بطور امیدوار کھڑے ہونے کے متعلق مودودی صاحب کا اُس وقت کا اسلام جب انہیں معلوم تھا کہ انتخابات میں ان کی جماعت کا کوئی امیدوار بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ہے اُن کا اِس وقت کا اسلام جس کی رُو سے وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی تمام نشستوں کے لئے اپنے آدمی بطور امیدوار کھڑے کریں گے!

یہ ہے پاکستان میں اسلامی نظام کی واحد اجارہ دار جماعت کے "اسلام" کی کیفیت۔

ہم آئندہ الیکشن کے رائے دہندگان کو مشورہ دیتے ہیں کہ اگر آپ کے پاس جماعت اسلامی کا امیدوار یا اس کا کوئی نمائندہ ووٹ کے لئے آئے تو آپ اسے جماعتِ اسلامی کا مندرجہ بالا فیصلہ دکھا دیجئے، اور کہئے کہ یہ امیدوار خود آپ حضرات کے اپنے فیصلہ کی رُو سے غیر صالح، نااہل اور خطرناک ہے۔ ہم خدا اور رسول کے کھلے کھلے ارشادات سے سرکشی برت کر اسے کس طرح ووٹ دے دیں۔ اور اپنے حق میں کانٹے بوئیں؟

۳۔ وحدت و سالمیتِ پاکستان

منشور کے دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ

جماعتِ اسلامی کے پیشِ نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے جو قرآن و سنت کے اتباع کی پابند ہو اور خلافتِ راشدہ کے نمونے کی پیروی ہو۔

اور "اصولِ عامہ" کے تحت کہا گیا ہے کہ ہر پارٹی کے لئے اس ضابطہ اخلاق کی پابندی لازم ہوگی کہ نظریۂ پاکستان (یعنی اسلامی نظامِ حیات) اور ملک کی وحدت اور سالمیت کے خلاف کوئی کام نہ کیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جماعتِ اسلامی یہ کرے گی کہ

(۱) ون یونٹ کو توڑ کر مغربی پاکستان کے سابق صوبے بحال کر دیئے جائیں۔ کوئٹہ قلات ڈویژن اور لس بیلا کو ایک پورے صوبے کا درجہ دیا جائے۔ کراچی کو سندھ میں شامل کر دیا جائے اور بہاولپور کو ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ اور

(۲) دفاع۔ امور خارجہ۔ کرنسی اور دفاعی مالیات۔ بیرونی اور بین العلاقائی تجارت اور مواصلات اور دوسرے امور جن پر اتفاق ہو مرکز کے پاس رہیں اور ان کے ماسوا تمام اختیارات صوبوں کو منتقل کر کے انہیں مکمل علاقائی خود مختاری دے دی جائے۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ

(۱) کیا خلافتِ راشدہ میں بھی حکومت کا یہی نقشہ تھا کہ چند امور مرکز کی تحویل میں رکھ کر، ولایات (صوبوں) کو کامل خود مختاری حاصل تھی، یا اس میں کامل اختیارات مرکز کو حاصل تھے اور صوبے، مرکز کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ تھے!

(۲) کیا ملک کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دینے سے، پاکستان کی وحدت اور سالمیت باقی رہ سکیگی؟ کیا اس قدر کمزور مرکز، پاکستان کے استحکام کا ضامن بن سکیگا؟ کیا اس تجویز کا جذبہ محرکہ، وہی عناد نہیں جو تحریک پاکستان کے خلاف، جماعتِ اسلامی کے دل میں پہلے دن سے موجزن رہا ہے اور جو چھلک چھلک کر ان الفاظ میں باہر آتا رہا ہے کہ

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں مسلمان جہاں جہاں کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔
>
> (مودودی صاحب۔ ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

۴۔ پارلیمانی نظام

جماعتِ اسلامی پارلیمانی نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتی ہے جس میں فیصلے کثرتِ رائے سے ہوتے ہیں۔ اور صدر مملکت کو ان فیصلوں کو مسترد کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا لیکن اس سے پہلے مودودی صاحب کے اسلام کا فیصلہ یہ تھا کہ

> جب امیر کو چن لیا جائے تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات حاصل ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرتِ رائے سے ہونگے۔ مگر اسلام، تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے

پوری مجلس کے مقابلہ میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (اسلام کا نظریۂ سیاسی۔ صفحہ ۵۲-۵۱)

انہوں نے ترجمان القرآن بابت جون ۱۹۵۲ء میں اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی تھی۔ کہ

امیر مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا استعمال کر سکیگا۔ (ایضاً)

لیکن اب "اکثریت کے فیصلے" عین مطابق اسلام قرار پا رہے ہیں اور امیر کا ویٹو کا حق غیر اسلامی!

۵۔ پارلیمانی پارٹی

مودودی صاحب کے اسلام کے سابقہ ایڈیشن میں یہ کہا گیا تھا کہ

مجالس قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔

(دستوری تجاویز صفحہ ۱۴)

اور اس کا حالیہ ایڈیشن (یعنی منشور) یہ کہتا ہے کہ

صوبائی اور نیشنل اسمبلیوں میں جماعتِ اسلامی کی پارلیمانی پارٹی حسب ذیل اصول پر کام کرے گی۔

وہ بھی اسلام تھا اور یہ بھی اسلام ہے!

———— (۰) ————

۶۔ وطنیت کی تفریق

جماعتِ اسلامی کا دعوےٰ یہ ہے (اور یہ دعویٰ بے شک اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے) کہ

(۱) تمام مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور

(۲) وطن کی جغرافیائی حدود یا نسلی امتیازات کی بنا پر تفریق کفر ہے۔

لیکن وہ اپنے منشور میں "مشرقی پاکستان" کے عنوان کے تابع کہتی ہے کہ

مرکزی ملازمتوں میں آئندہ تقررات آبادی کے تناسب کے لحاظ سے کئے جائیں۔

ہم پوچھتے ہیں کہ اشتراکِ ایمان کی بنیادوں پر متشکل ایک قوم میں، جغرافیائی حدود کی بنا پر اس قسم کی تفریق،

کون سے اسلام کی رُو سے جائز قرار پاتی ہے؟ ملازمتوں کا معیار قابلیت ہونا چاہیئے نہ کہ مختلف صوبوں کی آبادی کا تناسب۔ یہ ملازمتوں میں علاقائی تناسب تھا جس سے ملک تفریق و انتشار کے جہنم کے کنارے تک پہنچ گیا ہے۔ اور اب جماعتِ اسلامی اسے مستقل حیثیت دے دینا چاہتی ہے۔

(۰)

۷۔ کافرانہ حکومت

مودودی صاحب تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے سلسلہ میں یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اس میں حکومت مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترکہ جمہوریت پر مبنی ہوگی اور اس قسم کی حکومت ہندوستان کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہوگی۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ) اس سلسلہ میں انہوں نے ایک غیر مسلم کے اس سوال کے جواب میں کہ ایک اسلامی حکومت کی پارلیمان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی، لکھا تھا کہ

> اس مجلس میں غیر مسلموں (اہل ذمہ) کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ملیگا۔
> (اسلامی ریاست۔ ص ۵۲۵۔ ۱۹۶۷ء ایڈیشن)

لیکن اب (جماعتِ اسلامی کے منشور کی رو سے) پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو نہ صرف حق رائے دہندگی حاصل ہوگا بلکہ وہ مجلس آئین و قوانین ساز کے رکن بھی بن سکیں گے۔ اس سلسلہ میں پریس کانفرنس میں جب مودودی صاحب پر اعتراض کیا گیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ

> یہ دراصل ایسے ذمی نہیں ہیں جیسے ابتدائے اسلام میں ہوا کرتے تھے یعنی وہ غیر مسلم جو جنگ سے مغلوب ہو کر مسلمانوں کی حکمرانی قبول کرتے تھے۔ یہ لوگ ایک سیاسی نظام کے تحت ذمی ہوئے ہیں۔ اسلئے اگر وہ قومی اسمبلی میں آتے ہیں تو ہمیں یہ صورتِ حال قبول کرنی پڑے گی۔

لیکن جس سوال کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ ذمی اسلامی حکومت کی اسمبلی کے ممبر نہیں بن سکتے، اس میں جنگ میں مغلوب شدہ غیر مسلم ذمیوں کا ذکر نہیں تھا۔ اسی قسم کے غیر مسلموں کا ذکر تھا جو اس وقت پاکستان میں بستے ہیں لیکن وہ اس وقت کا اسلام تھا۔ یہ آج کی مصلحت کوشیوں پر مشتمل اسلام ہے۔

لیکن ٹھہریئے۔ مودودی صاحب نے "اسی سوال و جواب کی مجلس" میں یہ بھی فرمایا ہے کہ

> غیر مسلم اسلامی حکومت میں کسی ایسے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا جو ملک کی پالیسی بنانے سے تعلق رکھتا ہو۔

سوال یہ ہے کہ جس دستور ساز اور قانون ساز اسمبلی کے رکن غیر مسلم بن سکیں گے، کیا اس کا تعلق ملک کی پالیسی بنانے سے ہوگا یا نہیں!

اور آگے بڑھیئے۔ سوال کیا گیا کہ "کیا غیر مسلم عدالتوں کے جج نہیں بن سکتے؟"۔ جواب میں ارشاد ہوا:

ظاہر بات ہے کہ جن عدالتوں کا مقصد شرعی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا ہو، ان میں غیر مسلموں کو کیسے جج بنایا جا سکتا ہے۔

بجا اور درست! یعنی جن عدالتوں کا مقصد شرعی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا ہو، ان میں غیر مسلم جج تو نہیں بن سکتے لیکن جن اسمبلیوں کا مقصد شرعی قوانین وضع کرنا ہو، غیر مسلم ان کے رکن بن سکتے ہیں ——— جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے!

۸۔ معاشی اصلاحات

اس وقت ہمارے ملک کا گرم ترین مسئلہ معاشیات سے متعلق ہے اور اس باب میں بالخصوص جماعت اسلامی نے جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی حامی ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نظام کی کھلی ہوئی حمایت سے الیکشن میں ایک ووٹ بھی نہیں مل سکتا۔ حتیٰ کہ وہ سرمایہ دار بھی کھلے بندوں اس کے حق میں ووٹ دینے کی جرأت نہیں کریں گے جن کے مفادات کا تحفظ اس نظام سے وابستہ ہے۔ اس لئے اس باب میں یہ جماعت بڑی ہی "سادگی و پرکاری" سے کام لے رہی اور پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہے کہ سرمایہ داری کا تحفظ بھی ہو جائے اور عوام کو یہ بھی محسوس نہ ہونے پائے کہ یہ جماعت اس نظام کا تحفظ چاہتی ہے۔ زمینداری اور کارخانہ داری، نظامِ سرمایہ داری کے اہم ستون ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اس سے قبل، ان ہر دو امور کے متعلق جماعتِ اسلامی کے اسلام کا فتویٰ کیا تھا۔ مودودی صاحب نے اس موضوع پر اپنی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں بڑی وضاحت سے گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے، یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیت پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عاید کر سکتے ہیں اور نہ ہی ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں ..... اسلام ہم سے قطعاً یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو ..... وہ نہ یہ کہتا ہے کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے۔ اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر

> کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں...... اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیعِ فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ (صفحہ ۷۲-۷۳۔ ۱۹۵۰ء ایڈیشن)

بات صاف ہے کہ اسلام کی رُو سے زمین کی ملکیت کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ "جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلاحد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔" (صفحہ ۵۲)

اب منشور میں کہا گیا ہے کہ:

> قدیم املاک کے معاملہ میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائے گا۔ مغربی پاکستان کے زرخیز علاقوں میں یہ حد زمین کی پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے سو (۱۰۰) اور دو سو (۲۰۰) ایکڑ کے درمیان ہوگی اور جن علاقوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت بہت کم ہے وہاں اس معیار کے لحاظ سے حد مقرر کی جائے گی۔ مشرقی پاکستان میں سو (۱۰۰) بیگھہ کی حد رکھی جائے گی۔ اس سے زائد ملکیتوں کو منصفانہ شرح پر خرید لیا جائے گا۔

آپ نے جماعتِ اسلامی کے اسلام کے ان دونوں ایڈیشنوں کا فرق ملاحظہ فرما لیا یعنی جس بات کو وہ اسلام کے اُس زمانے کے ایڈیشن کی رُو سے "خدا و رسول کے مطیعِ فرمان سوچ بھی نہیں سکتے تھے" وہ اب عین مطابقِ اسلام قرار پا رہا ہے۔

جہاں تک زائد ملکیتوں کو خریدنے کا تعلق ہے، اس باب میں مودودی صاحب کا اُس زمانے میں ارشاد یہ تھا کہ "اسلامی شریعت، تمام افراد کی تو ایک طرف کسی ایک فرد کی ذاتی ملکیت کو اس طرح ساقط کر دینے یا اس کو اپنے املاک کی فروخت پر مجبور کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتی۔"

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۵۸)

منشور میں اس شق کو داخل کرنے کے ساتھ ہی خیال آیا کہ اس سے بڑے بڑے زمیندار بدک جائیں گے۔ تو ان کے اطمینان کی خاطر ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ

> یہ تحدید صرف عارضی طور پر پھیلی ناہمواریاں دور کرنے کے لئے کی جائے گی۔ اسے مستقل حیثیت نہیں دی جائے گی۔

اور یہ بھی کہ "مزارعت کے تمام اسلامی قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے گی۔" واضح رہے کہ جماعتِ اسلامی کے اسلام کی رو سے 'مزارعت' (یعنی زمین کو ٹھیکہ یا بٹائی پر کاشت کرانا) عین مطابقِ شریعت

ہے۔ اس قانون کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے گی۔

اب آیئے صنعت (انڈسٹری) کی طرف۔ اس باب میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا انڈسٹری کو ذاتی ملکیت میں رکھا جائے یا اسے قومی ملکیت میں بھی لیا جا سکتا ہے؟ اس باب میں مودودی صاحب کا فیصلہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ انہوں نے "مسئلہ ملکیت زمین" میں لکھا تھا۔

> اسلامی نظریۂ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں۔۔۔۔۔ اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ (صفحہ ۷۰)

یعنی ذرائع پیداوار (زمین یا کارخانوں) کو قومی ملکیت میں لینا ایک ایسا نظام ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔

اب زیر نظر منشور میں ارشاد ہوتا ہے کہ

> ہم قومی ملکیت کے نظام کو بطور اصول اختیار کرنے کے مخالف ہیں لیکن جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جن کا نجی حیثیت سے چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے انہیں قومی ملکیت میں بمعاوضہ لے لینے یا خود حکومت کے انتظام میں قائم کرنے اور چلانے کو ناجائز بھی نہیں سمجھتے۔

یعنی جس چیز کو پہلے ایسا انسانیت کش نظام قرار دیا جاتا تھا کہ شیطان اس سے بڑھ کر ملعون نظام ایجاد نہیں کر سکا۔ اب اسے ناجائز تک بھی نہیں سمجھا جا رہا!

مودودی صاحب نے زمین اور صنعت کو قومیانے کے خلاف دلیل یہ دی تھی کہ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں، انہی کے ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر آجائے۔۔۔۔۔ تو اس سے پوری سوسائٹی اس مختصر سے گروہ کی غلام بن کر رہ جائے گی۔ (مسئلہ ملکیت زمین۔ صفحہ ۷)

سوال یہ ہے کہ جب حکومت کتاب و سنت کے مطابق قائم ہوگی۔ اور اسے چلانے والے آپ جیسے صالحین ہونگے تو کیا اس وقت بھی ایسا خطرہ لاحق ہوگا؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس اسلامی حکومت اور فرعونی حکومت میں کیا فرق اور صالحین اور مفسدین میں کیا امتیاز ہوگا!

بینکنگ اور انشورنس کے متعلق جماعت اسلامی بارہا یہ کہہ چکی ہے کہ یہ سودی کاروبار ہے جو از روئے اسلام حرام ہے۔ اب اس سلسلہ میں تحریر ہے کہ

ہمارے نزدیک بینکنگ اور انشورنس کے پورے نظام کو اسلامی اصولِ شرکت و مضاربت اور تعاونِ باہمی کے مطابق از سرِ نو تعمیر کرنا چاہیئے۔

"مضاربت" کے معنی ہوتے ہیں۔ (SLEEPING PARTNERSHIP)۔ یعنی ایک شخص روپیہ لگائے اور دوسرا کاروبار کرے، اور روپیہ لگانے والا منافع میں شریک ہو۔

کیا یہ "سودی کاروبار" ہی کا دوسرا نام نہیں ؟

تجارت میں منافع کی حد

پریس کانفرنس کے حسبِ ذیل سوال و جواب، نہایت دلچسپ ہیں۔

سوال :۔ ملازمین کے بارے میں تو منشور کے اندر یہ پالیسی بیان کی گئی ہے کہ ان کے معاوضوں کے درمیان موجودہ تفاوت کو گھٹا کر ایک اور بیس، اور پھر بتدریج ایک اور دس کی سطح پر لے آیا جائے گا۔ لیکن تجارت پیشہ افراد پر کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی ہے۔ آخر یہ فرق کیوں ہے ؟

جواب :۔ (مولانا نے قدرے متبسم لہجے میں فرمایا) جی ہاں۔ یہ فرق تو حضرت آدمؑ کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ ملازم بہرکیف اپنی محنت کا معاوضہ پاتا ہے۔ اور تجارت پیشہ اپنے سرمائے سے منافع کماتا ہے۔

بالکل بجا فرمایا آپ نے! قرآن کی رُو سے ابلیس اور آدم، دونوں بیک وقت اسٹیج پر سامنے آتے ہیں۔ اس لئے یہ ابلیسی نظام کہ معاوضہ سرمایہ کا بھی ہوتا ہے اور اس کی کوئی حد نہیں ہوتی، واقعی نمودِ آدم کے وقت سے چلا آرہا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ خدائی نظام کے علمبردار حضرات انبیاء کرامؑ اس ابلیسی نظام کو مٹانے کے لئے مبعوث ہوتے رہے اور قرآن نے اسے ربٰو قرار دے کر خدا اور رسول کیخلاف اعلانِ جنگ سے تعبیر کیا ـــ لیکن ابلیسی نظام کے حاملین کو اس سے کیا غرض !)۔

جمہوریت کا مطلب

اور یہ سوال و جواب بھی ـــ

سوال :۔ اگر مارکسی نظریہ کی حامل کوئی پارٹی برسرِ اقتدار آجائے جو ملک کے تمام وسائل کو قومی ملکیت میں لینے کی مدعی ہو تو آپ کیا کرینگے ؟

جواب :۔ ہم مارکسی نظام کی سخت مخالفت کرینگے، خواہ اس کے نتیجہ میں ہمیں ملک بدر کر دیا جائے۔

یا سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ ملک کے تمام وسائل اگر سرکاری ملکیت میں ہوں تو یہ بدترین آمریت ہوتی ہے۔ آخر ۲۲ سال سے ہم ہر ساتھی کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ اگر باقی زندگی بھی اسی جہاد میں بسر ہوتی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ واضح ہے کہ جماعتِ اسلامی کے نزدیک 'جمہوریت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں اور وہ اس امر کی مدعی ہے کہ اس کی تمام تگ و تاز ملک میں جمہوری نظام قائم کرنے کے لئے وقف ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر عین جمہوری طریق کے مطابق کوئی ایسی جماعت برسرِ اقتدار آجائے جو ملک کے تمام وسائل کو قومی ملکیت میں لینے کی مدعی ہو' تو جماعت اسلامی کو (اصولِ جمہوریت کی رُو سے) کیا حق پہنچیگا کہ وہ اس جماعت کی مخالفت کرے؟ آپ نے غور فرمایا کہ جماعتِ اسلامی کے نظریۂ جمہوریت کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ اگر یہ جماعت خود' یا اس کی کوئی ہمنوا جماعت' برسرِ اقتدار آجائے تو اسے جمہوریت کہا جائے گا۔ اور اگر ان کی کوئی مخالف جماعت جمہوری طریق سے برسرِ اقتدار آجائے تو اس کے خلاف جہاد کیا جائیگا۔

ضمناً۔ مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ وہ گزشتہ بائیس سال سے مصروفِ جہاد ہیں۔ معلوم نہیں انہوں نے اس قدر کسر نفسی سے کیوں کام لیا۔ اور اُس مدت کو اس میں شامل کیوں نہیں کیا جس میں وہ (تقسیم ہند سے پہلے) تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں مصروفِ جہاد رہتے اور (معاذ اللہ) قائداعظم کا "منہ کالا کرنے"[1] کو کارِ ثواب سمجھتے تھے!

۹۔ خارجہ پالیسی

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اینگلو امریکی بلاک کیطرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں' مودودی صاحب حکومت پاکستان سے بھی پیش پیش تھے۔ چنانچہ جب (۱۹۵۵ء میں) حکومت کیطرف سے امریکہ کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کی سلسلہ جنبانی ہوئی ..... تو مودودی صاحب نے کھلے بندوں کہا تھا کہ امریکہ کو چاہیئے کہ حکومت کی بجائے عوام کے نمائندوں کے ساتھ معاملہ کرے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸ / دسمبر ۱۹۵۵ء کو لاہور کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ خود اینگلو امریکی بلاک کو بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر وہ صرف

---

[1] "یہ بحث ان لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

(ترجمان القرآن - جون ۱۹۴۶ء صفحہ)

مسلمان حکمرانوں سے معاملہ کرنا چاہتا ہے اور اس کو مسلمان قوم کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کرنا ہے تو الگ بات ہے لیکن اگر اس کی خواہش یہ ہے کہ مسلمان ممالک کے عوام بھی اس کے ساتھ تعاون کریں تو اس معاملہ میں ہمیں واضح طور پر بتا دینا چاہیئے کہ مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آ رہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو سکے۔

(تسنیم - ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء)

اس سے پہلے انہوں نے اپنی کراچی کی ایک تقریر میں اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم ممالک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے ان حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہیں۔

(تسنیم - ۱۶ دسمبر ۱۹۵۵ء)

امریکہ نے پاکستان سے دوستی کا معاہدہ کھلے بندوں کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس نے مودودی صاحب کے "ناصحانہ مشورہ" پر بھی غور کیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہوا کیا، ہمیں نہ اس کا علم ہے نہ اسے معلوم کرنے کی ضرورت لیکن اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ جماعتِ اسلامی کی طرف سے پاکستان - امریکہ کے تعلقات کی کبھی مخالفت نہیں ہوئی۔

لیکن جونہی پاکستان نے چین سے تعاون کا معاہدہ کیا اس جماعت کی طرف سے قیامت برپا کر دی گئی۔ دلیل یہ دی گئی کہ چین سوشلزم کا علمبردار ہے اور سوشلزم کا فلسفہ اور نظامِ تمدن و اجتماعیت اسلام کے خلاف ہے اس لئے پاکستان کا چین کے ساتھ تعاون کا معاہدہ نہیں ہونا چاہیئے۔

یعنی اینگلو امریکی بلاک کا فلسفۂ حیات اور نظامِ تمدن و اجتماعیت تو عین مطابق اسلام تھا اس لئے اس بلاک کے ساتھ نہ صرف بین المملکتی معاہدہ ناقابلِ اعتراض تھا بلکہ انہیں عوام کا تعاون حاصل ہونا بھی ضروری تھا۔ اور چین کا نظامِ اجتماعی چونکہ اسلام کے خلاف ہے اس لئے اس کے ساتھ سیاسی معاہدہ بھی نہیں ہونا چاہیئے۔

مودودی صاحب کی پریس کانفرنس میں اس موضوع پر سوال اور جواب بھی قابلِ ملاحظہ ہیں۔

سوال :۔ منشور میں کہا گیا ہے کہ ہم دوسری قوموں کے ساتھ کسی ایسے تعلق یا دوستی یا اتحاد کے لئے تیار نہیں ہیں جو ہمارے نظریۂ حیات کے خلاف ہو۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت حکومت کی جو خارجہ پالیسی ہے آپ اس کے خلاف ہیں؟

جواب :۔ ہم نے موجودہ حکومت کی خارجہ پالیسی کے بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے، بلکہ اپنی خارجہ پالیسی بیان کی ہے۔ ہم اپنے نظریۂ حیات اور تہذیبی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دوسرے ممالک سے دوستی کے خواہاں ہیں۔ ہم اس بات کے روادار نہیں ہیں کہ جس کے ساتھ دوستی کی جائے اس کے نظریات کو بھی گلے لگا لیا جائے۔ جیسا کہ پہلے ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ حکومت کی خارجہ پالیسی وہی ہے جو اس سے ماقدم حکومت کی تھی جب آپ اس حکومت کی خارجہ پالیسی کی اسقدر مخالفت کرتے تھے تو کیا آپ کی وہ مخالفت موجودہ حکومت کی خارجہ پالیسی کی مخالفت قرار نہیں پائے گی ـــــ بالخصوص جب آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ "جیسا کہ پہلے ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے"

دوسرے یہ کہ حکومتِ پاکستان نے چین سے جو معاہدہ اتحاد کیا ہے، کیا اس میں یہ شق بھی رکھی گئی ہے کہ پاکستان، چین کے نظریۂ حیات کو بھی گلے لگا لے گا؟ کیا اس معاہدہ کے بعد حکومتِ پاکستان نے اپنے نظریۂ حیات میں کوئی تبدیلی کر لی تھی؟

حیرت ہے کہ یہ لوگ حقیقت کو چھپانے اور عوام کو دھوکا دینے کے لئے کیا کیا حربے استعمال کرتے ہیں!

(۰)

۱۰۔ قانون سازی

اب ہم اس گوشے کی طرف آتے ہیں جو سب سے اہم بھی ہے اور لطیف ترین بھی۔ پاکستان کا خطۂ زمین اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ اسلامی مملکت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس میں اسلامی قوانین رائج ہوں۔ اس سے واضح ہے کہ مملکتِ پاکستان کے ضمن میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی قوانین کس طرح وضع کئے جائیں گے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد مملکت سے متعلق تمام مسائل کو گردش کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر حیرت افزا اور تاسف انگیز ہے کہ ملک کے لیڈر سیاسی میدان میں مجنونانہ مصروفِ تگ و تاز ہیں۔ دن رات دورے ہوتے ہیں، جلوس نکالے جاتے ہیں، جلسے

ہوتے ہیں، تقریریں کی جاتی ہیں، بیانات دیئے جاتے ہیں، مباحثے اور مناظرے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے پر اعتراضات ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی پارٹی کے مقاصد شد و مد سے سامنے لائے جاتے ہیں۔ ان میں دنیا جہان کے امور سے بحث ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی گوشہ ایسا ہے جس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا تو وہ یہی مرکزی سوال ہے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کس طرح وضع کئے جائیں گے۔ اس کا معیار کیا ہو گا اور آخری اتھارٹی کون ہی۔ کون فیصلہ کرے گا کہ فلاں قانون اسلامی ہے یا نہیں۔ کون بتائے گا کہ فلاں معاملہ میں اسلام ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ ہمارے لیڈر حضرات' اور سینکڑوں امور پر سرگرم بحث و محیص رہیں گے لیکن ان سوالات کے متعلق کچھ سوچنے یا کہنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔ حالانکہ یہی وہ بنیاد ہے جس پر مملکت پاکستان کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے لیکن اسے اگر کسی نے درخور توجہ سمجھا ہے تو وہ امیر جماعت اسلامی مودودی صاحب ہیں۔ یہ بساطِ سیاست کے نہایت پُرکار مہرہ باز ہیں۔ انہوں نے خاموشی ہی خاموشی میں اپنی نردیں اس طرح جما رکھی ہیں کہ آخرالامر یا تو مملکت کا سارا اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو گا یا یہاں خون کی ندیاں بہیں گی ہمیں افسوس ہے کہ ملک کے کسی لیڈر نے بھی ان کی اس چال کو نہیں بھانپا ۔ نہ مسٹروں نے اور نہ مولاناؤں نے ۔ لہٰذا یہ گوشہ ایسا ہے جو ملک کے ہر بہی خواہ کی گہری توجہ کا محتاج ہے۔

مودودی صاحب شروع سے زور دیتے چلے آ رہے ہیں کہ مملکت کا کوئی قانون 'کتاب و سنت' کے خلاف نہیں ہو گا۔ یہ اصول' نظر بظاہر ایسا مقدس، معصوم اور متفق علیہ سمجھا جاتا ہے جس میں نہ کسی کو کوئی شک و شبہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی اعتراض لیکن آیئے ہم دیکھیں کہ مودودی صاحب نے اس دامِ ہمرنگ زمین کے نیچے اپنی آمریت کو کس چابکدستی سے چھپا رکھا ہے۔

ہمارے مروجہ اسلام میں 'کتاب (یعنی قرآن) کا مقصد محض تلاوت برائے ثواب رہ گیا ہے۔ قوانین کا مدار "سنت" پر قرار دیا جاتا ہے۔ ہم طلوع اسلام کے صفحات پر سینکڑوں بار اس حقیقت کو پیش کر چکے ہیں کہ "سنت" کی کوئی متفق علیہ تعریف (DEFINITION) ابھی آج تک سامنے نہیں لائی جا سکی سمٹ سمٹا کر بحث اس نقطہ پر آ پہنچی ہے کہ سنت' یا تو احادیث ہی کا دوسرا نام ہے اور یا اسے احادیث سے مرتب کیا جائے گا۔ لہٰذا اسلامی قوانین کے سلسلہ میں ساری اہمیت احادیث کو حاصل ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں میں یوں تو متعدد فرقے ہیں لیکن بنیادی طور پر انہیں دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس کا مسلک یہ ہے کہ مذہب سے متعلق ہر معاملہ میں سند' اور حجت' حدیث کو ہوتی ہے۔ دوسرا گروہ جو کہتا ہے کہ سند اور حجت تو بے شک حدیث ہی ہوتی ہے لیکن احادیث کی جو تعبیر ہمارے ائمہ فقہ نے کی ہے ہمارے لئے وہی سند اور حجت کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اول الذکر گروہ کو عرفِ عام میں اہلِ حدیث اور ثانی الذکر کو اہلِ فقہ کہتے

ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ حنفی فقہ کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اسلئے یہاں اہل فقہ سے مراد حنفی حضرات ہیں۔

اہل حدیث ہوں یا اہل فقہ، ان سب کا مسلک یہ ہے کہ احادیث کی جس قدر چھان بین مطلوب تھی وہ ہو چکی ہوئی ہے اور یہ امر طے شدہ ہے کہ کون سی حدیث صحیح ہے اور کون سی ضعیف۔ احادیث کی ان حیثیتوں میں اب کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ احادیث کی یہ حیثیت کوئی سربستہ راز نہیں۔ ان کی کتابوں میں اسکی تصریح موجود ہے جسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ اگر آپ کسی اہل حدیث سے پوچھیں گے کہ فلاں معاملہ میں اسلام (یا شریعت) کا کیا حکم ہے تو وہ اس کے جواب میں ان احادیث کے مجموعوں میں سے کوئی حدیث پیش کر دیں گے جو ان کے نزدیک صحیح ہیں۔ اسی طرح کسی حنفی سے آپ پوچھیں گے تو وہ اس کے جواب میں اپنے کسی امام کا قول پیش کر دینگے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہوگا کہ وہ فلاں حدیث پر مبنی ہے۔ بہرحال اہل حدیث ہوں یا اہل فقہ ان کے نزدیک شریعت کے تمام احکام طے شدہ ہیں۔ ان میں کوئی بھی اپنے آپ کو اس کا مجاز نہیں سمجھتا کہ اپنے کسی خیال یا فیصلہ کو شریعت کا فیصلہ کہہ کر دوسروں سے منوائے۔ ان کے بڑے سے بڑے عالم کی حیثیت فیصلہ بتانے والے کی ہوتی ہے فیصلہ کرنے والے کی نہیں۔ لیکن ان سب کے برعکس مودودی صاحب نے اپنے لئے ایک منفرد مقام متعین کر رکھا ہے۔ اور وہ مقام ہے

مذہبی آمریت (ڈکٹیٹرشپ)

کا۔ یہ بات غور سے سننے کے قابل ہے۔

(۱) مودودی صاحب نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ یہ بات غلط ہے کہ احادیث کی مستقل طور پر پرکھ اور پہچان ہو چکی ہے۔ وہ رسائل و مسائل" (جلد اول) میں لکھتے ہیں۔

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسول اللہ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیدیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (صفحہ ۲۹۰) . . . . جتنے کہ یہ دعویٰ کرنا بھی صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

یعنی احادیث کے موجودہ مجموعوں میں صحیح احادیث بھی ہیں اور غلط بھی۔ اور اس بات کی پرکھ نئے سرے سے کی جائیگی کہ کون سی حدیث ماننے کے قابل ہے اور کون سی حدیث مسترد کر دینے کے لائق۔ اس سے سوال یہ سامنے آیا کہ ان کے

پرکھنے کا اصول اور معیار کیا ہوگا۔ اس کے متعلق جو کچھ مودودی صاحب نے فرمایا ہے وہ اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

مزاج شناسِ رسولؐ

جس شخص کو اللہ تعالےٰ تفقہ کی نعمت سے نوازتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعے سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیت نبوی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتی ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے، اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو اس میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ثبوت کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ اس میں کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنتِ نبوی سے اقرب ہے۔ (تفہیمات حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۳-۳۲۴)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ ان کا ارشاد یہ ہے کہ

(۱) اسلامی قانون وہ ہے جو صحیح احادیث پر مبنی ہو۔

(۲) احادیث کے موجودہ مجموعوں میں صحیح احادیث بھی ہیں اور غلط بھی۔

(۳) یہ بات صرف مزاج شناسِ رسولؐ ہی بتا سکتا ہے کہ کون سی حدیث صحیح ہے اور کون سی غلط۔ جسے وہ صحیح کہہ دے اسے صحیح تسلیم کرنا ہوگا، جسے وہ غلط کہہ دے اسے غلط قرار دینا ہوگا۔

اس کے بعد یہ ارشاد ہے:۔

یہی نہیں، بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرمؐ کے سامنے فلاں مسئلہ پیش ہوتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔

(ایضاً)

بالفاظِ دیگر اسلامی مملکت میں قوانین سازی کے سارے اختیارات "مزاج شناسِ رسولؐ" کو حاصل ہوں گے۔اب سوال یہ ہے کہ اس وقت یہ "مزاج شناسِ رسولؐ" کون سے بزرگ ہیں۔یہ سوال آپ جماعتِ اسلامی سے متعلق کسی صاحب سے پوچھئے' وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ یہ مودودی صاحب ہیں۔چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی نے (جو اس زمانے میں مودودی صاحب کے دستِ راست تھے) منیر کمیٹی کے سامنے یہی کہا تھا کہ اس وقت "مزاج شناسِ رسولؐ" مودودی صاحب ہیں۔اور ماہر القادری صاحب نے (ماہنامہ فاران کی جون ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں) لکھا تھا کہ

> کوئی شک نہیں کہ مودودی صاحب کی شخصیت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ ہے وہ مقام جسے مودودی صاحب نے اپنے لئے تجویز کر رکھا ہے۔اس کے بعد آپ خود ہی اندازہ فرمالیجئے کہ یہاں قانون سازی کے آخری اختیارات کسے حاصل ہوں گے۔آپ اس بحث میں الجھے رہیے کہ حکومت کا نظام پارلیمانی ہوگا یا صدارتی۔ ایوان ایک ہوں گے یا دو۔ نظام وفاقی ہوگا یا وحدانی، اسمبلی میں نشستیں کس تناسب سے مقرر کی جائیں گی وغیرہ وغیرہ۔لیکن یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد جب اصل سوال سامنے آئے گا کہ مملکت میں قانون سازی کی آخری سند وحجت کیا ہوگی' تو اس کا جواب یہ ملیگا کہ وہ مودودی صاحب کی شخصیت ہوگی' کیونکہ وہی اس دور کے مزاج شناسِ رسولؐ ہیں۔ان کے فیصلے کتاب وسنت کے فیصلے تصور کئے جائینگے اور ان سے انحراف' ارتداد سمجھا جائے گا جس کی سزا قتل ہوگی۔

فرمائیے! ہم نے جو شروع میں کہا تھا کہ آپ جن بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں' الجھے رہئیے۔بات سمٹ سمٹا کر یہاں آجائے گی کہ یا تو آپ کو مودودی صاحب کو آمرِ ناطق تسلیم کرنا پڑے گا اور یا یہاں خون کی ندیاں بہیں گی' وہ کس قدر مبنی بر حقیقت ہے۔

اس کے بعد آپ خود سوچ لیجئے کہ مودودی صاحب جب یہ کہتے ہیں —— اسلامی قوانین۔اسلامی نظریۂ حیات۔اسلامی اصول۔اسلامی شریعت۔اسلامیات کا نصابِ تعلیم تو اس سے ان کا مطلب کیا ہوتا ہے اور جب وہ کہتے ہیں کہ جو شخص یا گروہ یہاں "غیر اسلامی نظریۂ حیات" لانا چاہے گا' اسے مٹا دیا جائے گا تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے!

یہ ہے اس گوشے کی اہمیت۔لیکن (جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے) اسے اس وقت نہ مسلم لیگ کے لیڈر درخورِ اعتنا سمجھتے ہیں' نہ مولوی حضرات اپنی توجہ کا مستحق۔"مسٹروں" کو تو چھوڑیئے' ہم مولانا حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ کے نزدیک بھی اسلام یہی ہے؟ اور اگر یہ نہیں تو کیا آپ نے کبھی سوچا بھی ہے کہ آپ

جو اس جماعت کی حمایت کر رہے ہیں (یا خاموش بیٹھے ہیں) تو کیا یہ اسلام کی خدمت ہے! کیا اس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ حضرات متحدہ طور پر مودودی صاحب سے کہیں کہ وہ غیر مبہم اور واضح الفاظ میں بتائیں کہ

(۱) ان کے نزدیک 'سنت' کی تعریف کیا ہے؟

(۲) احادیث کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار کیا، اور

(۳) پاکستان میں اسلامی قوانین کے وضع کرنے اور پرکھنے کا طریق و اسلوب کیا ہوگا۔

اگر آپ حضرات نے ان سے ان امور کی وضاحت نہ کرائی تو آپ سوچ لیجئے کہ آپ اسلام کے لئے کس قدر مہیب خطرہ اور پاکستان کو ہلاکت کے کس قدر عمیق جہنم میں گرانے کے جرم کی اعانت کے مرتکب ہوں گے اور عدالتِ خداوندی میں آپ کا جواب کیا ہوگا!

ہم نے جب یہی سوالات مودودی صاحب سے کئے تو وہ بھانپ گئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی خاص ٹیکنیک سے کام لیا اور مشہور کر دیا کہ طلوع اسلام منکر حدیث ہے، منکر شانِ رسالت ہے اور اس کے بعد ایسی ڈگڈگی بجائی کہ ہر شخص کی توجہ طلوع اسلام کے مزعومہ انکار حدیث کی طرف منعطف ہوگئی۔ اور مودودی صاحب خاموشی سے اپنی ہیرہ بازیوں میں مصروف رہے۔ ہم مولانا حضرات سے یہ عرض کریں گے کہ آپ اسے چھوڑیئے کہ طلوع اسلام منکر حدیث ہے یا معترف۔ آپ مودودی صاحب سے مندرجہ بالا سوالات پوچھیئے اور اس باب میں پوزیشن صاف کرا لیجئے۔ ورنہ یاد رکھیئے کہ وہ آپ کی حمایت سے برسر اقتدار آئیں گے اور پھر آپ ہی کو اپنے استبداد کی گرفت میں لیں گے۔

۱۱۔ فرقہ پرستی اور شخصی قوانین

منشور میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

> مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا پورا حق ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ انہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

پہلے تو آپ یہ دیکھئے کہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جو ضمانت دی جاتی ہے وہ بعینہٖ وہی نہیں ہوتی جو مسلمانوں کے مسلمہ فرقوں کے لئے تجویز کی جا رہی ہے۔ کیا ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ "مسلمہ فرقوں" سے باہر کون سے مسلمان رہ جاتے ہیں جن کے لئے ان خصوصی تحفظات کی ضرورت نہیں پڑے گی؟

دوسرے دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن کریم نے بنص صریح فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۲) اسے خدا کا عذاب ٹھہرایا ہے (۶/۶۵) رسول اللہ سے تاکیداً کہا گیا ہے کہ جو لوگ فرقے بنا لیں تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ (۶/۱۵۹) اور احادیث نبوی میں فرقہ بندی کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ "کتاب وسنت" کی ایسی واضح تصریحات کے بعد وہ کون سا اسلام ہے جس کی رُو سے مسلمانوں کے فرقوں کو آئینی طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے؟

پھر یہ جو کہا گیا ہے کہ "ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے" تو وہ کون سا اسلام ہے جس کی رُو سے شخصی اور تمدنی قوانین میں اس قسم کی تفریق جائز ہے؟ یہ تفریق سیکولر حکومت کی پیدا کردہ ہے جسے یہ حضرات اسلامی مملکت میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

متفرقات

منشور میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

(۱) جو لوگ محمد رسول اللہ کے بعد کسی اور کو نبی مانتے ہیں اور اسکی نبوت پر ایمان نہ لانے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس پر بعض گوشوں کی طرف سے یہ اعتراض ہوا کہ جو لوگ رسول اللہ کے بعد کسی اور کو نبی مانیں لیکن اسکی نبوت پر ایمان نہ لانے والوں کو کافر نہ قرار دیں ان کے متعلق کیا ارشاد ہے؟

(۲) عورتوں کو شریعت کے عطا کردہ حقوق دلوانے کے لئے قوانین بنائے جائیں گے اور رائج الوقت عائلی قوانین کو احکام شریعت کے مطابق درست کیا جائے گا۔

یہاں اس امر کی تشریح نہیں کی گئی کہ "شریعت" سے کیا مراد ہے۔ "مزاج شناسِ رسولؐ کے فیصلے"؟

(۳) اتوار کے بجائے جمعہ کی تعطیل مقرر کی جائے گی ـــــ قرآن کریم میں تو مسلمانوں سے تاکید کی گئی ہے کہ وہ جمعہ کے روز کاروبار کیا کریں۔ (دیکھئے سورۂ الجمعہ)

(۴) اوقاف کا انتظام شرعی احکام کے مطابق کیا جائے ـــــ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ قرآن میں کہیں وقف کی بھی اجازت دی گئی ہے؟ کیا قرآن کسی ایسی صورت کو جائز قرار دے گا جس میں مردے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا حکم زندہ انسانوں پر چلاتے رہیں اور حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں زندہ انسان مُردوں کے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہ کر سکیں؟ وقف اس کے سوا اور کیا ہے!

(۵) خاندانی منصوبہ بندی کی پوری اسکیم ختم کر دی جائے ـــــ تاکہ ملک کی آبادی لامتناہی طور پر بڑھتی جائے

اور ملک غلّہ خریدنے کے لئے امریکہ کا محتاج رہے۔

(۶) اسلامیات کو لازمی مضمون قرار دیا جاتا ہے ۔۔۔ یعنی اس اسلامیات کو جس سے قرآن کریم کی سورتوں کو حذف کر کے جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کو داخلِ نصاب کیا گیا ہے۔

(۷) سرکاری افسروں کے لئے "قومی لباس" لازمی قرار دیا جاتا ہے ۔۔۔ یہ کون سا لباس ہوگا؟

———(۰)———

۱۲۔ کیا یہ وعدے ایفا بھی کئے جائیں گے؟

آخر میں ایک دلچسپ بات بھی سنتے جائیے۔ مودودی صاحب سے (پریس کانفرنس میں) ایک صاحب نے سوال کر ڈالا کہ آپ نے جو اپنے منشور میں ہر ایک سے اس قدر فیاضانہ وعدے کر دیئے ہیں کیا انہیں پورا بھی کیا جائے گا؟ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے (حسبِ معمول) الفاظ کا ایک گورکھ دھندا پھیلا دیا جس کا ملخص یہ تھا کہ

> پچھلے سال میں ملک کے عوام اور ملک کے مختلف علاقوں کے لوگوں کو جو شکایات بھی حکومت اور اس کے آئین و قانون اور نظم و نسق سے پیدا ہوئی ہیں ان کی ذمہ داری میں جماعتِ اسلامی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ جماعت اس معاملہ میں بالکل صاف کردار کے ساتھ انتخابات میں حصہ لے رہی ہے اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر اعتماد نہ کریں۔

لیکن یہی سوال جب جماعتِ اسلامی سرگودہا ڈویژن کے امیر اسعد گیلانی سے کیا گیا تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ

> جماعتِ اسلامی برسرِاقتدار آنے کے بعد دیکھے گی کہ ملکی وسائل اس قابل ہیں یا نہیں کہ اس کے انتخابی منشور میں کئے جانے والے تمام وعدے پورے کئے جائیں اور منشور پر عملدرآمد کیا جائے۔ (امروز۔ لاہور۔ بابت ۱۰/۱)

معلوم بیچارے گیلانی صاحب کو غیر شعوری طور پر یہ سچی بات پبلک میں کہہ دینے کی کیا سزا بھگتنی پڑے گی!

———(۰)———

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا؟

طلوع اسلام جس قسم کا قرآنی معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے اسمیں :-

(۱) ہر شخص کی عزت بلا تمیز مذہب ۔ رنگ ۔ نسل ۔ پیشہ محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہوگی۔ کسی کو پست یا ذلیل نہیں سمجھا جائیگا۔ بہتری کا معیار یہ ہوگا کہ کوئی شخص قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کس قدر محنت اور دیانت سے کام لیتا ہے۔ اسکا کیریکٹر کیسا ہے اور وہ نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچانے کی خاطر کیا کرتا ہے۔

(۲) کوئی شخص بے کس ولاچار اور بے یار و مددگار نہیں ہوگا۔ ہر ایک کی بات سنی جائیگی اور تکلیف رفع کیجائیگی۔ ہر شخص کو انصاف ملیگا اور بغیر کچھ خرچ کئے ملیگا۔ کوئی صاحبِ اثر انصاف کے پلڑے کو اپنی طرف نہیں جھکا سکیگا۔

(۳) کوئی فرد بھوکا، ننگا یا بے گھر نہیں رہیگا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان وغیرہ بنیادی ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔

(۴) معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت اور بوقتِ ضرورت علاج معالجہ کا تسلی بخش اور بلا معاوضہ انتظام کرے۔ تعلیم و تربیت کا منشا، حصولِ علم کے علاوہ فرد کی ذات کا استحکام اور اسکی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوگا۔ بالفاظِ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔ "فرد" میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اور سفرِ زندگی میں دوش بدوش چلنے کے قابل۔

(۵) ہر شخص اپنی پوری استعداد اور محنت سے کام کرے گا۔ صرف وہ افراد کام نہیں کرینگے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں۔ یہ نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو محنت کرتے کرتے ہلکان ہو جائیں اور کچھ لوگ ان کی کمائی پر مفت میں عیش اڑائیں۔

(۶) ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھیگا جس سے اس کی مناسب ضروریات پوری ہوں۔ باقی سب کا سب محتاجوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے نظامِ مملکت کی تحویل میں دے دیگا۔ اور

مندا ضرورت دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیگا۔ کیونکہ انسانی ذات کی نشوونما کا یہی طریق ہے۔ یہ سب کچھ قرآنی نظام کے ذریعے عمل میں آئے گا۔

(۷) رزق کے سرچشمے (خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا کارخانوں کی صورت میں) اُمت کی تحویل میں رہینگے۔ تاکہ وہ افراد (معاشرہ کی پرورش کے کام آئیں۔ قرآنی نظام انہیں نظم و نسق کی خاطر۔ بطور امانت افراد کے سپرد کریگا۔

جب افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی اور رزق کے سرچشمے حاجتمندوں کے لئے کھلے رہیں گے تو اس کیلئے دولت سمیٹ کر جمع کرنے اور جاگیرداریاں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

(۸) ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے احکام (قرآن کریم) کے مطابق ہوگا نہ کسی خاص فرد یا طبقہ کی مرضی کے مطابق۔ (اس میں گروہوں اور پارٹیوں کا وجود ہی نہیں ہوگا) اسلئے اس معاشرہ میں نہ کسی قسم کا جور ہوگا، نہ استبداد۔ نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔

(۹) ہر شخص کھل کر بات کریگا۔ اس کے دل میں نہ کسی کی طرف سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا نہ کسی کو نقصان پہنچانے کا خیال۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ ہوگا اور دھوکا اور فریب کی گنجائش نہیں ہوگی۔ اس طرح گھروں کے اندر سکون اور معاشرہ کے اندر اطمینان ہوگا۔

(۱۰) یہ سب کچھ اسلئے ہوگا کہ ہر شخص قوانینِ خداوندی کے محکم اور مکافاتِ عمل کے اٹل ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ معاشرہ قائم ہی انہی بنیادوں پر ہوگا۔

(۱۱) اس معاشرہ میں نظامِ حکومت کمیونزم کی ڈکٹیٹرشپ یا مغرب کی لادینی جمہوریت یا تھیاکریسی کے بجائے خالص قرآنی اصولوں کے مطابق قائم ہوگا۔

طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے معاشرہ کے قیام کے لئے کوشش کرتا ہے اگر آپ بھی اس سے متفق ہوں تو اس کے لئے آپ طلوعِ اسلام سے تعاون کریں اور اس کے خلاف پھیلائے ہوئے غلط خیالات کو اہمیت نہ دیں کیونکہ وہ جھوٹا پراپیگنڈہ ہے جس کی اصلیت کچھ نہیں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

جمعیتہ علماء اسلام (ہزاروی گروپ) کا منشور

جمعیتہ علماء اسلام (ہزاروی گروپ) نے بھی اپنا انتخابی منشور شائع کیا ہے جو روزنامہ امروز (لاہور) کی ۱۴ جنوری کی اشاعت میں چھپا ہے۔ اس کی چیدہ چیدہ (اہم) شقوں پر تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ مملکت کا مذہب

منشور کی شق اول یہ ہے کہ "مملکت کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا"۔ مذہب ہمیشہ افراد کا ہوتا ہے ــ ایک فرد کا مذہب یا افراد کے مجموعہ (قوم) کا مذہب ــ کیا یہ حضرات بتائیں گے کہ "مملکت کے سرکاری مذہب" سے ان کی مراد کیا ہے؟ یا انہوں نے محض ایک سنی سنائی بات، بلا سوچے سمجھے لکھ دی ہے!

۲۔ مسلمان کی تعریف

آپ کو یاد ہوگا کہ منیر کمیٹی نے پاکستان کے علماء کرام سے یہ سوال پوچھا تھا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ اور اس کا جواب کسی سے بھی بن نہیں پڑا تھا۔ اس وقت سے آج تک یہ سوال زیرِ بحث رہا اور کسی قولِ فیصل تک نہ پہنچ سکا۔ جب دستورِ پاکستان میں یہ شق رکھی گئی کہ صدرِ مملکت مسلمان ہوگا تو ہم نے کہا تھا کہ اب یہ مسئلہ نظری یا اعتقادی نہیں رہا ــ دستوری یا قانونی ہوگیا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی کوئی تعریف (DEFINITION) متعین کی جاتے۔ لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ بارے الحمد کہ جمعیتہ علماء نے اسے درخورِ اعتنا سمجھا ہے اور منشور میں مسلمان کی تعریف یہ دی ہے کہ

> مسلمان وہ ہے جو قرآن و حدیث پر ایمان رکھتے ہوئے ان کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم و اسلاف رحمہم اللہ اجمعین کی تشریحات کی روشنی میں سمجھے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شریعت کا قائل نہ ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس منشور کی رُو سے مسلمان کسے سمجھا جائے گا؟ اول تو یہی واضح نہیں کہ اسلاف علیہم الرحمۃ سے مراد کون سے فرقے کے اسلاف ہیں اسلئے کہ یہاں ہر فرقہ کے اپنے اپنے اسلاف ہیں۔ لیکن اگر اسلاف سے مراد جمعیت علماء اسلام کے اسلاف ہیں تو اس سے ایک صورت سامنے آئیگی اور وہ یہ کہ (مثلاً) اگر اسلاف نے یہ کہا ہو کہ زمین ساکن ہے، اور کوئی شخص یہ کہہ دے کہ نہیں، زمین متحرک ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور مرتد سمجھا جائے گا۔ اور مرتد کی سزا، ان حضرات کے نزدیک قتل ہے۔

۳۔ صدرِ مملکت

منشور میں کہا گیا ہے کہ

> صدرِ مملکت کا مسلمان ہونا اور پاکستان کی ۹۸ فیصد مسلمان اکثریت اہل سنت کا مسلک ہونا ضروری ہے۔

اس میں اس امر کی تصریح نہیں کی گئی کہ صدر کا، اہل سنت میں سے، اہل حدیث ہونا ضروری ہوگا یا حنفی۔ اور حنفیوں میں سے دیوبندی ہونے کی شرط ہوگی یا بریلوی کی۔ اس لئے کہ یہ سب فرقے ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں۔

۴۔ غیر اسلامی عقائد کی تبلیغ

منشور میں کہا گیا ہے کہ

> اسلام اور اس کے کسی بھی حکم و عقیدہ کے خلاف کسی قسم کی تنقید و تبلیغ کی نہ تقریری اجازت ہوگی نہ تحریری۔

اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ پابندی کس فرقے کے اسلام کے حکم و عقیدہ سے متعلق ہوگی؟ مثلاً، جمعیۃ علماء اسلام، دیوبندی حضرات پر مشتمل ہیں جن کے اسلام کی رُو سے، نماز میں آمین آہستہ سے کہنا چاہیئے۔ اور اہل حدیث آمین، بلند آواز سے کہتے ہیں۔ کیا اہل حدیث حضرات کو دیوبندی حضرات کے اس عقیدہ اور عمل پر تنقید کرنے یا اپنے مسلک کی تبلیغ کرنے کی اجازت ہوگی یا نہیں؟

۵۔ اللہ کی حاکمیت اور عوام کا اقتدار

منشور میں کہا گیا ہے کہ:۔

دستور میں یہ بات قانوناً واضح کر دی جائے گی کہ حاکمیت صرف اللہ رب العالمین کی ہے اور اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر پاکستان کے مسلمان عوام مملکتِ پاکستان کے اختیارات کے اصل مالک ہونگے۔

اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ "اللہ کی مقرر کردہ حدود" کہاں مندرج ہیں۔ اگر اس سے مراد دستورِ قرآنِ کریم ہے تو اس کی وضاحت کر دینی چاہیئے تھی۔

۶۔ فرقہ بندی

منشور میں کہا گیا ہے کہ

مسلمانوں میں آئندہ نئی فرقہ بندی اور ارتداد کی اجازت نہیں ہوگی۔

ان حضرات کو تسلیم ہے کہ فرقہ بندی اسلام کی رو سے ناجائز ہے لیکن یہ پابندی صرف آئندہ کے لئے ہے۔ جو فرقے پہلے بن چکے ہیں ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ یعنی جس چیز (فرقہ بندی) کو قرآن کریم شرک اور کفر قرار دیتا ہے وہ اگر مسلمانوں میں رائج ہو چکی ہے تو اسے علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے گا۔ البتہ آئندہ کے لئے اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

باقی رہا ارتداد۔ سو ان حضرات کے نزدیک اس سے مراد صرف اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لینا ہی نہیں ہوتا جس شخص کے کسی عقیدہ کو یہ حضرات خلافِ اسلام قرار دے کر اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیں وہ بھی مرتد سمجھا جاتا ہے اور واجب القتل قرار پاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ حضرات ۱۹۵۶ء کے آئین کو اس لئے اسلامی نہیں سمجھتے کہ اس میں مرتد کی سزا قتل نہیں رکھی گئی۔ اب اگر یہ حضرات برسرِ اقتدار آ گئے تو آپ سوچ لیجئے کہ پاکستان میں ان حضرات کے ہم مسلک و ہم عقیدہ لوگوں کے علاوہ کوئی زندہ بھی رہ سکیگا؟ دوسری طرف یہی مسلک مودودی صاحب کا بھی ہے۔ وہ بھی اپنے ہمنوا لوگوں کے علاوہ سب کو (ایک سال کا نوٹس دے کر) قتل کر دینے کا فیصلہ فرما چکے ہیں۔ خدا ان حضرات کو ایک دفعہ برسرِ اقتدار آنے دیں پھر دیکھیئے گا کہ اس ملک کا حشر کیا ہوتا ہے!

۷۔ آئینی مسائل

منشور میں ون یونٹ کو توڑنے، اسمبلیوں میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی مقرر کرنے اور امورِ خارجہ، دفاع، کرنسی، بین الصوبائی اور بیرونی تجارت کے محکمے مرکز کے پاس چھوڑ کر صوبوں کی مکمل

خود مختاری تجویز کی گئی ہے (ان امور پر ہم جماعت اسلامی کے منشور کے سلسلہ میں تبصرہ کر چکے ہیں)۔

۸۔ معاشی پروگرام

منشور کا بیشتر حصہ معاشی پروگرام پر مشتمل ہے کیونکہ یہی مسئلہ اس وقت (یوں کہیے کہ) الیکشن کیلئے قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے۔ اس ضمن میں جو کچھ منشور میں کہا گیا ہے وہ بڑا دلچسپ ہے لکھا ہے۔

(۱) قرآن و سنت کی روشنی میں انفرادی ملکیت ثابت اور محترم ہے بشرطیکہ جائز ذرائع سے حاصل کی گئی ہو۔ البتہ اگر حکومت سمجھے کہ کسی شخص کی ذاتی ملکیت مفادِ عامہ کے خلاف ہے تو حکومت اسکی ملکیت کو خرید کر بیت المال کی ملکیت قرار دے سکتی ہے۔

(۲) اراضی ملکیت کی کم یا زیادہ کوئی حد شریعت نے مقرر نہیں کی لیکن اگر بڑی زمینداریاں ملکی نظامِ معیشت اور اجتماعی نظم و نسق فاسد کرنے کا سبب بن گئی ہیں۔ . . . . تو اراضی کی ملکیت کی مناسب تحدید حکومت کریگی۔

(۳) جس نے بھی بے آباد زمین کو آباد کیا وہ زمین اس کے لئے ہے۔

(۴) نئی آباد کی جانے والی زمینوں کو آسان شرائط پر صرف خود کاشت کرنیوالوں کو دیا جائیگا۔ (ٹریکٹرز کے ذریعے ہزاروں ایکڑ زمین خود کاشت ہو سکتی ہے۔ طلوعِ اسلام)

(۵) زمین بٹائی پر بھی دی جا سکتی ہے اور حکومت یہ پابندی بھی لگا سکتی ہے کہ مالکِ زمین، زمین کو خود کاشت کرے یا کرایہ یا اجارہ پر اٹھا دے۔ (یعنی بٹائی پر نہ دے لیکن نقد ٹھیکہ پر بے شک دے دے)

(۶) ہر باشندۂ ملک کو صنعت و حرفت کا پیشہ اختیار کرنیکا حق ہوگا اور کارخانہ بھی قائم کر سکیگا لیکن بڑے بڑے کارخانے حتی الامکان عوامی حصص کی شرکت پر قائم کئے جائینگے (عوام بیچارے بڑے بڑے کارخانوں کے حصے جس حد تک خرید سکیں گے، وہ ظاہر ہے۔ طلوعِ اسلام)

(۷) بنیادی اور کلیدی صنعتوں کو جنکا تعلق مفادِ عامہ یا دفاعی اور عمومی نظام سے ہے، قومی تحویل میں لے لیا جائیگا۔

(۸) ملک کے قدرتی وسائلِ معیشت، معدنیات، گیس، پانی وغیرہ کسی ایک فرد، خاندان یا ادارہ کی ملکیت یا اجارہ داری میں رہنے نہیں دیئے جائینگے۔ انکے تصرف کا حق تمام عوام کو یکساں طور پر ہوگا۔ (لیکن زمین "قدرتی وسائلِ معیشت" میں شامل نہیں اس لئے ذاتی ملکیت میں رہنے دیا جائیگا ــــ یا للعجب۔ (طلوعِ اسلام)

(۹) ناجائز طریقوں سے حاصل شدہ دولت کو یا تو ان لوگوں کی طرف لوٹا دیا جائیگا جن سے وہ حاصل کی گئی تھی اور یا اسے ملک کے مفلس اور محتاج طبقہ میں تقسیم کر دیا جائیگا۔ (اور جو لوگ اس دولت کو اس سے پہلے ہی ختم کر چکے ہونگے؟ طلوعِ اسلام)

ان تجاویز کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے جو اقبالؒ نے کہا تھا کہ

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے ✽ اسکو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

جمہوریّت ـــ یا ـــ فریبِ جمہوریّت

سال گزشتہ ملک میں جو خلفشار پیدا کیا گیا اس کے لئے قوم کے لیڈر وجہ جواز یہ پیش کرتے تھے کہ وہ سب کچھ جمہوریت کی بحالی کے لئے کر رہے ہیں۔ وہ حکومت بدلی۔ مارشل لاء نافذ ہوا۔ اب آئندہ الیکشن کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ قوم کے لیڈر شادیانے بجا رہے ہیں کہ اب جمہوریت بحال ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ جس قاعدے کے مطابق یہ الیکشن ہوں گے کیا اس سے واقعی جمہوری نظام قائم ہو جائے گا؟ یہ سوال بڑا غور طلب ہے اور گہری سوچ کا متقاضی۔

جمہوریت سے مراد لی جاتی ہے "ملک کے عوام کی حکومت"۔ اور اس کا عملی طریق یہ بتایا جاتا ہے کہ عوام اپنے نمائندے منتخب کریں اور یہ نمائندگان عوام کی طرف سے کاروبارِ مملکت سرانجام دیں۔ سوال یہ ہے کہ موجودہ طریق کے مطابق جو نمائندگان منتخب ہوں گے، وہ فی الواقع عوام کے نمائندے ہوں گے یا ہو سکتے ہیں؟ بات سمجھنے کے لئے فرض کیجئے کہ ایک حلقۂ انتخاب میں دو کارخانے ہیں اور ووٹر بیشتر ان کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور۔ ان کارخانوں کے مالک ایک نشست کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک کامیاب ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کارخانے کا مالک ان مزدوروں کا نمائندہ کہلا سکتا ہے جن کے ووٹوں سے وہ منتخب ہوا ہے؟ مزدوروں کا نمائندہ مل کا مالک کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ان کی نمائندگی کیسے کر سکتا ہے، مل کے مالک کے اور مزدوروں کے مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ یہ مل کا مالک کسی صورت میں بھی اپنے مفاد کو قربان کر کے مزدوروں کے مفاد کا تحفظ کرے گا؟ آپ کہیں گے کہ ان مزدوروں نے اسے ووٹ کیوں دیئے؟ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ اسے ووٹ نہ دیتے تو دوسرا امیدوار بھی تو مل کا مالک ہی تھا۔ اسے ووٹ دیتے تو وہ بھی یہی کچھ کرتا۔ ان مزدوروں کے لئے، اس کے سوا چارہ کار ہی نہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ووٹ دیتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں یہ مزدور خود اپنے میں سے کسی کو بطور امیدوار کھڑا کر سکتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایسا کر سکتے تھے لیکن یہ حالات موجودہ کیا

یہ ممکن تھا کہ یہ مزدور امیدوار، مل کے مالک کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاتا؟ ہم جیسے غیر یا نیم تعلیم یافتہ ممالک تو ایک طرف، اس کا امکان تو ہنوز ان ممالک میں بھی نہیں جہاں عوام کا سیاسی شعور بیدار ہے اور وہ اپنی روٹی کے لئے بالادست طبقہ کے اس قدر دستنگر بھی نہیں۔

کارخانوں سے پیچھے ہٹ کر شہر کے محلوں کی طرف آیئے۔ وہاں بھی یہی کیفیت نظر آئے گی۔ ووٹ دینے والے عوام غریب ہوں گے اور امیدوار محلہ کے چوہدری (جواب دولت مند کا دوسرا نام ہے) ان عوام میں سے کس کی مجال ہے کہ ان کے مقابلہ میں کھڑا ہو جائے یا کھڑا ہو کر کامیاب ہو جائے۔ محلوں سے بھی کوئی نہ کوئی "چوہدری" ہی منتخب ہو کر عوام کے نمائندہ کی حیثیت سے اوپر پہنچے گا۔ شہروں سے باہر نکل کر، دیہاتی علاقوں میں جایئے۔ وہاں حالت اس سے بھی بدتر دکھائی دے گی۔ وہاں ووٹ دینے والے مزارع یا مزدور کاشتکار ہوں گے اور امیدوار بڑے بڑے سردار۔ ان کے مقابلہ میں کسی مزارع کے سر اٹھا کر چلنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ الیکشن میں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ ان مزارعوں اور کاشتکاروں کے نمائندے بھی یہی بڑے بڑے زمیندار ہوں گے جن کے مفاد قدم قدم پر ان غریبوں کے مفاد سے ٹکراتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اس طریق سے جس قدر ممبر منتخب ہو کر آئینگے ان میں سے کسی ایک کو بھی آپ اس اسی نوّے فیصد آبادی کا نمائندہ کہہ سکیں گے جن کی نمائندگی کرنے کے یہ مدعی ہوں گے؟

اس نظام کو اگر واقعی جمہوری نظام بنانا مقصود ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ:—

حلقہ ہائے انتخاب آمدنی کے معیار کے مطابق متعین کئے جائیں — مثلاً سو روپیہ ماہوار آمدنی والے افراد پر مشتمل ایک حلقہ۔ ان افراد کی تعداد کی نسبت سے اس میں نشستوں کا تعین۔ اور اس کے بعد شرط یہ کہ اس حلقہ میں سے امیدوار وہی کھڑے ہو سکتے ہیں جن کی آمدنی اتنی ہو۔ اسی شکل کو آگے بڑھاتے جایئے مثلاً سو سے پانچ سو روپے ماہوار آمدنی والوں کا الگ حلقۂ انتخاب۔ اور امیدوار بھی انہیں میں سے — اسے اسی طرح بڑھاتے بڑھاتے آپ لاکھوں روپے ماہوار آمدنی تک لے جایئے۔ ظاہر ہے کہ جوں جوں ہم اوپر اٹھتے جائیں گے نشستوں کی تعداد کم ہوتی جائے گی اور آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے کا پورا ایوان قوم کے صحیح نمائندگان پر مشتمل ہوگا اور ان میں اکثریت ان کی ہوگی جن کی بہ لحاظ آبادی ملک میں اکثریت ہوگی۔ یعنی جمہور (عوام) کی اکثریت۔ اس پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہیں گے کہ امیدواروں کے لئے کم از کم تعلیم کی شرط بھی ضرور عاید ہونی چاہیئے۔ اس کے لئے تعلیمی معیار بھی آمدنی کی نسبت سے رکھا جائے۔ سو روپیہ ماہوار آمدنی والوں کے لئے پرائمری یا مڈل تک کی شرط ہی کافی ہے۔ جوں جوں اوپر اٹھتے جائیں تعلیمی معیار بھی

بلند ہوتا جاتا ہے۔ صدارت کے لئے البتہ معیار آمدنی نہیں، صرف تعلیم رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ صدر مملکت کسی خاص حلقۂ انتخاب کا نمائندہ نہیں ہوتا، پورے ملک کا نمائندہ ہوتا ہے۔

اس طریق انتخاب کی رُو سے (علاوہ اس کے کہ قوم کے نمائندے فی الواقعہ قوم کے نمائندے ہوں گے) سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ الیکشن کی خرابیاں (جن کا ہم اس قدر رونا روتے رہتے ہیں) خود بخود دور ہو جائیں گی۔ سو روپیہ ماہوار آمدنی والا امیدوار اپنے ووٹروں کو رشوت کہاں سے دیگا اور جھوٹے سچے پراپیگنڈے کے لئے رقم کہاں سے لائے گا؟ اور لاکھ روپیہ ماہوار آمدنی والا اگر رشوت دینا چاہے گا تو اس کے ووٹر بھی اُسی کی حیثیت کے ہوں گے۔ انہیں خریدنے کے لئے اُسے بکنا پڑیگا۔

یہ تو رہا عام آبادی کی نمائندگی کا سوال۔ جہاں تک خصوصی مفادات کا تعلق ہے ان کے لئے نشستیں الگ مخصوص کی جا سکتی ہیں یا ایوان بالا مقرر کیا جا سکتا ہے۔ "خصوصی مفادات" سے ہماری مراد ہے (مثلاً) ڈاکٹر، وکلاء، جج صاحبان، اساتذہ، اہل قلم، سائنٹفک تحقیقات کے ماہر، صنعت و حرفت، تجارت، زراعت وغیرہ۔ ان کے لئے یہی انتخابی حلقے ہوں۔ وہی ووٹ دینے والے اور انہی میں سے امیدوار۔

ہم نے اس تجویز کو اکتوبر ۱۹۶۷ء میں پیش کیا اور اس کے بعد جنوری ۱۹۶۹ء میں اسے دہرایا۔ اور پھر اس انتظار میں رہے کہ جو لوگ جمہوریت کی بحالی کے لئے اس قدر تڑپتے نظر آ رہے ہیں کیا وہ اس کی تائید کرتے ہیں: لیکن آپ حیران ہوں گے کہ مزدوروں اور غریبوں کی طرف سے تو اس کا بڑا پُر مسرت استقبال ہوا لیکن لیڈروں میں سے کسی ایک نے بھی اس کی تائید نہ کی۔ اگرچہ (ہماری اطلاع کے مطابق) نجی محفلوں میں وہ اسے بہت سراہتے رہے۔ بہرحال، اب یہ طے ہو چکا ہے کہ آئندہ انتخابات مروجہ طریق کے مطابق ہی ہوں گے اور اب وقت نہیں رہا کہ اس میں کوئی تبدیلی کرائی جا سکے۔ ہم نے اب اس تجویز کو محض اسلئے دہرایا ہے کہ عوام پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ قوم کے اِن لیڈروں کا یہ دعویٰ کس قدر صداقت پر مبنی ہے کہ وہ ساری کوششیں عوام کے اقتدار اور بہبود کی خاطر کرتے ہیں؟۔ ان کے اس قسم کے دعاوی سب باطل ہیں۔ یہ لوگ سب کچھ اپنے اقتدار کی خاطر کرتے ہیں اور عوام کو صریحاً دھوکا دیتے ہیں۔ یاد رکھیے! عوام کا سچا بہی خواہ وہی ہوگا جو اُن کے اقتدار کے لئے کوشش کرے گا!

(۔۔۔)

رَہزنی

ہر ایک خطرناک ہوتی ہے۔ ——— لیکن

سب سے زیادہ خطرناک رہزنی وہ ہے جو

مذہب کے نام پر خُدا اور رسُول کے نقاب میں کی جائے

اس میں ——— انسانیت لُٹتی ، اور عاقبت تباہ ہوتی ہے

اگر آپ دیکھنا چاہیں کہ لوگ مذہب کے نام پر کس طرح اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین چاہتے ہیں۔ تو

مزاج شناسِ رسولؐ

کا مطالعہ کیجئے!

اس سے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ جماعتِ اسلامی کے عزائم کیا ہیں اور وہ کس طرح قوت حاصل کرنے کیلئے ہر قسم کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی اور اسکے امیر کی ڈکٹیٹر شپ پر اتنا مواد اور اس انداز سے مربوط شکل میں آپکو کہیں اور نہیں ملیگا!

قیمت مجلد: چار روپے

ملنے کا پتہ:- مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور

باب المراسلات

اسے کہتے ہیں سیاست!

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ اسرائیلی عدالت نے مسجد اقصیٰ میں آگ لگانے والے کو پاگل قرار دے کر اس فسانے کو ختم کر دیا۔ جب اس مسجد میں آتش زنی کی خبر دنیا میں پھیلی تھی تو ایسا نظر آتا تھا کہ مسلمان مملکتیں قیامت برپا کر دیں گی اور جب تک اسرائیل کو ارضِ مقدس سے نکال باہر نہیں کریں گی، آنکھ کی نیند نہیں سوئیں گی۔ لیکن چار دن کے بگولے کے رقص کے بعد سب پر اوس پڑ گئی اور اب یہ قصہ بھی داستانِ پارینہ بن گیا۔ جماعتِ اسلامی، جو اس حادثہ پر اس جوش و خروش سے اٹھی تھی، وہ بھی الیکشن کے دھندے میں مصروف ہو گئی۔ کس قدر مقامِ تاسف ہے!

طلوع اسلام: مقامِ تاسف ہی نہیں۔ اس سے آگے بھی ہے۔ جماعتِ اسلامی کے امیر نے اس باب میں جو کھیل کھیلا ہے، اس کا نوٹس بہت کم لوگوں نے لیا ہے۔ لیکن آپ دیکھئے گا کہ وقت آنے پر یہودی اس سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہودیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ جس مقام پر اب مسجد اقصیٰ واقع ہے وہاں ان کا معبد تھا۔ مسلمانوں نے اس معبد کو منہدم کر کے اس کی جگہ مسجد بنا ڈالی۔ یہ ان کی دھاندلی تھی۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ اس مسجد کی جگہ پھر سے اپنے معبد کو تعمیر کریں۔

آپ نے یہودیوں کا دعوےٰ دیکھ لیا۔ اس کے جواب میں امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے، ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۶۹ء میں تحریر فرمایا کہ:

> (یہودیوں کے معبد) ہیکل سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ ۷۰ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہیں تھا۔ بلکہ یہاں کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اس لئے یہاں مسجد اقصیٰ اور قبۂ صخریٰ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں

لگا سکتا کہ ان کے کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔ (صلہ)

مودودی صاحب نے یہاں یہ کہا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت یروشلم میں یہودیوں کا کوئی معبد تھا ہی نہیں اس لئے ان کا یہ دعویٰ باطل ہے کہ مسلمانوں نے ان کے معبد کو توڑ کر وہاں اپنی مسجد بنا دی تھی۔ مودودی صاحب کے اس بیان پر مسلمان خوش ہو گئے اور (ظاہر ہے کہ) یہودی اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ہونگے۔ لیکن مودودی صاحب نے ان سے (کان میں) کہا کہ آپ جلدی سے ناراض نہ ہو جائیے۔ میں ابھی آپ کے دعوے کو مستحکم کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ اسی ماہ (ستمبر ہی میں) ایک صاحب نے ان کے درس قرآن و حدیث میں یہ سوال پوچھا کہ

> مسجد اقصیٰ کو قبلۂ اول کیوں کہا جاتا ہے جبکہ خانۂ کعبہ کی تعمیر اس مسجد سے پہلے عمل میں آئی تھی۔

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ انہوں نے کہا۔

> یہ قبلۂ اول اس لئے ہے کہ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھی پہلے اسی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ جب تحویل قبلہ کا حکم آگیا تو اس کی وہ اہمیت نہ رہی۔ لیکن قبلۂ اول ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے یہ عبادت گاہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقدس و محترم قرار پائی۔ ..... جب تک مکہ معظمہ میں حضورؐ کا قیام رہا آپ اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ مسجد اقصیٰ اور خانہ کعبہ ایک رُخ میں آجاتے تھے۔ لیکن مدینہ میں یہ التزام ممکن نہ رہا کیونکہ اب ان عبادت گاہوں کے رُخ مختلف سمتوں میں پڑتے تھے ..... (تحویل قبلہ سے پہلے) حضورؐ اور آپ کے صحابہؓ ایک طویل عرصہ تک مسجد اقصیٰ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے ہیں۔ (انبیاء۔ بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۹)

مودودی صاحب کے اس بیان سے واضح ہے کہ بعثت نبی اکرمؐ کے زمانے میں یروشلم میں یہودیوں کی ایک عبادت گاہ موجود تھی جسے مسجد اقصیٰ کہا جاتا تھا۔ اور حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ ایک طویل مدت تک یہودیوں کی اس مسجد کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔

یوں تو مودودی صاحب کی ساری زندگی تضادات کا مجموعہ ہے لیکن اس قسم کے تضاد کی مثال آپ کو کم ملے گی کہ ایک طرف آپ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ ظہور اسلام کے وقت بیت المقدس میں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا۔ اور پھر (اسی ماہ) یہ بھی فرماتے ہیں کہ ظہور اسلام کے وقت بیت المقدس میں یہودیوں کا ایک معبد تھا جسے مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے۔ اور اس کی طرف رُخ کر کے حضورؐ ایک طویل مدت تک نماز

پڑھتے رہے تھے۔

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب نے کس طرح (۱) اپنے پہلے بیان سے مسلمانوں کو خوش کر دیا۔ اور (۲) دوسرے بیان سے یہودیوں کو ان کے دعوے کے اثبات کے لئے ایک محکم دلیل اور مستند ہم پہنچا دی! اسے کہتے ہیں سیاست!

یا ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

۲۔ اکتساب رزق کی صلاحیتوں میں فرق

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔ قرآن نے کہا تھا۔ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق — طلوع اسلام نے اس خلش کو کسی حد تک دور کیا لیکن "ذہنی صلاحیتوں کے اختلاف" کا مسئلہ اب بھی بڑی پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ اگر میں غلط نہیں سمجھا تو طلوع اسلام بھی اس ذہنی اختلاف کو تسلیم کرتا ہے۔ (یعنی اسے خدا کی دین سمجھتا ہے)۔ ذہن اس سے بغاوت کرتا ہے۔ برائے مہربانی اس سلسلہ میں راہ نمائی فرمائیں۔ اور ممکن ہو تو تفصیلاً۔ میرا خیال ہے کہ قدرت اپنے عطیات کی تقسیم میں بخیل نہیں۔ وہ ہر چیز مساوی دیتی ہے۔ انسان اسے اپنے اعمال سے کم یا زیادہ کر لیتا ہے۔ اسلئے رزق میں فضیلت یا ذہنی فضیلت خدا کا عطیہ نہیں ہو سکتی۔ یہ فضیلت، وراثت، ماحول اور اعمال کی بنا پر ہوتی ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ یہ اکتسابی ہے وہبی نہیں۔

طلوع اسلام: طلوع اسلام بے شک ذہنی اختلاف کو تسلیم کرتا ہے اسلئے کہ یہ ایک امر الواقعہ ہے جس کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس لئے اس اختلاف کا انکار حقیقت کا انکار ہے۔ لیکن آپ نے اس کے بعد جو قوسین میں لکھا ہے (یعنی اسے خدا کی دین سمجھتا ہے) یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

ہماری بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ ہم جہاں جہاں قرآن کریم میں یہ لکھا پاتے ہیں کہ "خدا ایسا کرتا ہے" یا "خدا دیتا ہے" تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ایسا کچھ "وہبی طور پر" ہوتا ہے۔ اس میں انسان کے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں۔ ایسا سمجھنا غلط ہے۔ خدا اپنے عالم امر میں جو کچھ کرتا ہے اس میں کسی کے اختیار، ارادہ، عمل، دخل، کسب و ہنر کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن جو کچھ وہ محسوس کائنات میں کرتا ہے، وہ سب کچھ اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے اور انسانی دنیا میں خدا کا قانون طبیعی، انسانی ہاتھوں سے بروئے کار آتا ہے۔ مثلاً قرآن کا ارشاد ہے کہ خدا زمین سے رزق پیدا کرتا ہے۔ اب اگر کوئی قطعہ زمین بنجر پڑا ہو اور انسان اپنی کوشش سے

اسے زراعت کے قابل نہ بنائے اور اپنی محنت سے ہل چلا کر اس میں کاشت نہ کرے تو اس زمین سے رزق کبھی پیدا نہ ہوگا۔ لہٰذا، خدا کے اس کہنے کا (کہ ہم زمین سے رزق پیدا کرتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ زمین سے رزق، خدا کے قانون کے مطابق پیدا ہوتا ہے جس کے لئے انسانی سعی و کاوش کی ضرورت ہے۔ یا مثلاً حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا کہ جب مجھے پیاس لگتی ہے تو خدا مجھے پانی پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو خدا مجھے شفا دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ نہ خدا پیاس کے وقت حضرت ابراہیمؑ کو خود آکر پانی پلاتا تھا، نہ ہی ان کی بیماری کا علاج براہِ راست خود کرتا تھا۔ یہ سب خدا کے قانون کے مطابق حضرت ابراہیم کی اپنی کوشش سے ہوتا تھا۔ مقصد ہمارے کہنے کا یہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں (طبعی کائنات کے سلسلہ میں) اس قسم کے الفاظ آئیں (کہ خدا یوں کرتا ہے یا یوں دیتا ہے) تو وہاں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا "وہبی طور پر" ایسا کر دیتا ہے۔ انسان کے کسب و ہنر کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس قسم کی موہبت صرف نبوت کے لئے مختص تھی (اور وہ سلسلہ ختم ہو گیا)

اب آیئے ذہنی صلاحیتوں کی طرف۔ اسے دو شقوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ شق اول یہ کہ ایک قوم، دوسری قوم کے مقابل میں، بلند ذہنی صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے۔ اور شق دوم یہ کہ ایک ہی قوم میں بعض افراد دوسرے افراد سے مختلف صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

پہلے شق اول کو لیجئے۔ ماہرینِ علم عمرانیات یا علم الانسان کی تحقیق یہ ہے کہ انسان نے اپنی متمدنی زندگی کی ابتدا ایک خطۂ زمین (بحیرہ کیسپین کے ارد گرد کے علاقہ) سے کی تھی۔ اس کے بعد وہ پھیلتے پھیلتے مختلف ممالک میں چلے گئے اور مختلف اقوام میں بٹ گئے۔ ان اقوام میں، سنگِ طبعی عناصر و عوامل (مثلاً جغرافیائی اور موسمی اثرات وغیرہ) کے اختلاف سے، مختلف خواص پیدا ہو گئے جو پھر نسلی طور پر آگے منتقل ہوتے چلے گئے۔ یوں ایک قوم، دوسری قوم سے مختلف نظر آنے لگی اور ان میں صلاحیتوں کا اختلاف ابھر آیا۔ اس کے بعد تمدنی اور سیاسی اثرات سے، مختلف اقوام یا ایک ہی قوم کے مختلف گروہوں میں، صلاحیتوں کا اختلاف شروع ہوا۔ مثلاً زرخیز علاقوں میں بسنے والی قوم کو تھوڑی سی محنت سے ضرورت کے مطابق خوراک حاصل ہو گئی تو اسے مسائلِ زندگی پر فکری طور پر سوچنے کے لئے وقت اور فراغت مل گئی۔ اس سے اس کی ذہنی صلاحیتیں ابھرنی شروع ہو گئیں۔ اس کے برعکس، لوٹ مار پر گزارہ کرنے والی قوم میں جسمانی قوتوں نے زیادہ نشوونما پا لیا۔ یا قوم حاکم نے، محکوم قوم کو ایسا دبائے رکھا کہ اس میں انسانی صلاحیتیں ابھر ہی نہ سکیں۔ (جس علاقہ میں سکول نہ کھولنے دیا جائے، ظاہر ہے کہ وہاں کے رہنے والے جاہل رہیں گے اور یہی جہالت جب دو چار نسلوں تک متوارث چلتی جائے گی تو اس علاقہ کے لوگ وحشی کہلائیں گے۔ جس طرح عورت کو ناقص العقل کہا جاتا ہے۔)

اب اقوام سے نیچے اتر کر افراد کی طرف آیئے۔ انسانی بچے کی ساخت اور اسکی طبعی صلاحیتیں خدا کے مقرر کردہ قوانینِ طبیعی کے مطابق مرتب ہوتی ہیں۔ جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا جاتا ہے، یہ قوانین بے نقاب ہو کر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ جن اقوام نے ان قوانین کا علم حاصل کر لیا ہے، وہ رحمِ مادر ہی میں جنین کی دیکھ بھال شروع کر دیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کے بچے، ان اقوام کے بچوں کے مقابلہ میں جو ان قوانین کا علم نہیں رکھتیں، یا ان کے مطابق عمل نہیں کرتیں، کہیں زیادہ عمدہ صلاحیتیں لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ ان کے ہاں پیدائشی اندھے، لولے لنگڑے، مختلف امراض کا شکار، کمزور و نحیف یا دماغی نقائص کے حامل بچے نسبتاً بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ پیدائش کے بعد بھی بچوں کی طبعی نشوونما کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہتا ہے اسلئے وہ بچے تنومند و توانا اور شگفتہ و شاداب پروان چڑھتے ہیں۔

پیدائش کے بعد، بچوں کی صلاحیتوں پر ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے اور پھر تعلیم کا۔ وہ قومیں اس کا بھی خاص اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت (ان کے معیار کے مطابق) صحیح ہو۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ کسی بچے میں کوئی خاص جسمانی، ذہنی یا نفسیاتی نقص ہے تو وہ اس کے اسباب کی تحقیق کرتے ہیں اور اس کے بعد کوشش کرتے ہیں کہ اس بچے کا وہ نقص رفع ہو جائے اور آئندہ اس قسم کا نقص پیدا نہ ہو۔ بچوں میں ذہنی صلاحیتوں کے تفاوت کے اسباب یہی ہیں۔ اس کے بعد ان صلاحیتوں کی نمود کے لئے مواقع بہم پہنچانے، اور ان سے کام لینے کا سوال سامنے آتا ہے۔ زندہ قومیں یہ کچھ بھی خاص نظم و نسق اور ربط و ضبط کے مطابق کرتی ہیں۔

یہ ہے مطلب "فضل بعضکم علیٰ بعض فی الرزق" کا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ اختلاف خدا کا پیدا کردہ ہے اور اٹل ہے۔ یہ 'قوانینِ خداوندی' کی مطابقت یا ان سے انحراف کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اگر ان قوانین سے انحراف کی وجہ سے کہیں پیدا ہو گیا ہے تو ان کی مطابقت سے اسے دُور کیا جا سکتا ہے۔

یہ سب کچھ کہنے اور سمجھنے سمجھانے کے بعد بھی ایک چیز باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک بچہ جو کچھ بن کر پیدا ہوتا ہے، یا ابتدائی تعلیم اور ماحول کے اثرات سے جو کچھ اسے بنا دیا جاتا ہے، اس کا ذمہ دار وہ بچہ نہیں ہوتا۔ اس کا ذمہ دار معاشرہ ہوتا ہے۔ غلط معاشرہ میں، ایک بچہ (یا ایک فرد) ساری عمر اپنی اس کمی یا کمزوری کی سزا بھگتتا رہتا ہے جس کا ذمہ دار وہ خود نہیں ہوتا ــــ معاشرہ ہوتا ہے۔ قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں کوئی بچہ (یا فرد) اپنی اس کمی یا کمزوری کی سزا نہیں بھگتتا جس کا ذمہ دار وہ خود نہیں ہوتا ــــ جس معاشرہ میں وہ (قرآن) اپنے انقلاب کا آغاز کرتا ہے، ظاہر ہے کہ اس میں مختلف افراد میں اس قسم کے اختلافات موجود ہوتے ہیں۔ وہ ان اختلافات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر لیتا۔

وہ انہیں تسلیم کرتا ہے۔ (اور یہی وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام بھی بہ حالاتِ موجودہ، انہیں تسلیم کرتا ہے) لیکن وہ ایسے اصول دیتا ہے جنہیں عملاً بروئے کار لانے سے "کوئی فرد اپنے" ناکردہ گناہوں "کی وجہ سے (یعنی صلاحیتوں کے اس تفاوت کی وجہ سے) سزا میں ماخوذ نہیں ہوتا۔ اس باب میں اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ

(۱) ولقد کرّمنا بنی آدم - ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں طور پر واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ صلاحیتوں کے تفاوت کا شرفِ انسانیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

(۲) لکلٍ درجٰت مما عملوا - معاشرہ میں مدارج کا تعین، ہر فرد کے ان کاموں کی وجہ سے ہوتا ہے جنہیں وہ اپنے اختیار و ارادہ اور سعی و کاوش سے کرتا ہے ۔۔۔ ایک محنتی، اور دیانتدار جاہل، ایک فرض ناشناس اور بددیانت عالم سے کہیں زیادہ واجب العزت قرار پاتا ہے۔

(۳) ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتا ہے اور معاشرہ اس کی ضروریات پوری کر دیتا ہے ۔۔۔ حتیٰ کہ ان کی ضروریات بھی جو کسی ابتدائی نقص یا بعد کے حادثہ کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔

اس کے ساتھ ہی، یہ معاشرہ، ان افراد کی کمی کو پورا یا نقائص کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش اور آئندہ کے لئے ایسا انتظام کرتا ہے کہ بچوں میں اس قسم کے نقائص پیدا ہی نہ ہوں اور ان کی صلاحیتوں کی پوری کی پوری نشوونما ہو جاتے۔ (اسے نظامِ ربوبیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو قرآن میں عطا کردہ راہنمائی کی روشنی میں ہی قائم ہو سکتا ہے)

امید ہے اس وضاحت سے وہ چبھن دور ہو گئی ہو گی جس کی طرف ہمارے مستفسر نے اشارہ کیا ہے، اور جو موجودہ غلط معاشرہ میں ہر قلبِ حساس کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔

(باہر)

ضرورت رشتہ

متوسط گھرانے کی میٹرک، ایس۔ وی۔ پاس دوشیزہ کے لئے سلیم الطبع پڑھے لکھے، با روزگار، ۳۰ سال تک کے کنوارے کا رشتہ مطلوب ہے۔ پہلے خط میں مکمل تفصیلات بھیجیں۔

(آئی - معرفت ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ لاہور)

حقائق و عبر

۱۔ نظریۂ پاکستان کیا ہے؟

آپ نے غور کیا ہوگا کہ ہمارے ہاں کے ہمہ گیر خلفشار و انتشار کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی کے اہم معاملات سے متعلق ایسی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں جنکا مفہوم متعین نہیں کیا جاتا۔ جو مسلمان قوم' متعین طور پر یہ بھی نہ بتا سکے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں اور جن کے ہاں اسلام کا مفہوم بھی متعین نہ ہو' وہ زندگی کے دیگر مسائل کے متعلق کیا متعین کر سکے گی۔ لیکن یہ امور ایسے تھے جن سے صرف انتشار رونما ہوتا تھا۔ اب ان میں ایک ایسی اصطلاح کا اضافہ ہوا ہے جس کا تعلق قانون اور جرائم کی دنیا سے ہے اور وہ اصطلاح ہے "نظریۂ پاکستان"۔ مارشل لاء ریگولیشن ۱۹۷۰ء کی رُو سے "نظریۂ پاکستان" کے خلاف کچھ کہنا جرم ہے۔ لیکن نہ تو اس ریگولیشن میں' اور نہ ہی کہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کسے کہتے ہیں۔ قانون کا تقاضا یہ ہے کہ جس چیز کو جرم قرار دیا جائے اور اس کے ارتکاب کو مستوجب سزا' اس کی وضاحت کر دی جائے کہ وہ چیز ہے کیا۔ اس کے مطالب کیا ہیں اور حدود کیا، تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو سکے کہ کون سی حد و شکنی جرم قرار پا جائے گی۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء میں "سیاسی سرگرمیوں" میں حصہ لینا جرم قرار دیا گیا تھا لیکن اس کا تعین نہیں کیا گیا تھا کہ "سیاسی سرگرمی" کہتے کسے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص فوجی حکام کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ کسی کی جس حرکت کو چاہتے "سیاسی سرگرمی" قرار دے کر اسے دھر لیتے۔ ہم اربابِ حکومت سے گزارش کریں گے کہ جب "نظریۂ پاکستان" کے خلاف کچھ کہنے کو جرم قرار دیا گیا ہے تو اس کی وضاحت کر دی جائے کہ "نظریۂ پاکستان" سے مراد کیا ہے؟

(۰)

۲۔ ہیرو یا ناقابلِ اعتماد

آپ کا ایک دوست ہے۔ نہایت گہرا دوست۔ آپ دوستی کے اعتماد پر' بیسیوں راز کی باتیں اُسے بتا دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے کسی بات پر آپ سے اختلاف ہو جاتا ہے۔ آپ کے اس سے دوستانہ تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں اور وہ آئے دن آپ کو دھمکی دیتا رہتا ہے کہ میں تمہارے راز لوگوں کو بتا دونگا۔

فرمایئے کہ دوستی کے ضابطۂ اخلاق کی رُو سے آپ اس شخص کے اس طرزِ عمل کو کیا قرار دیں گے اور جو لوگ اُسے اُکسا اُکسا کر آپ کے راز معلوم کرنے کی کوشش کریں گے اُن کے کردار کے متعلق آپ کی کیا رائے ہوگی؟

یہ معاملہ انفرادی دوستی اور شخصی رازداری کا ہے۔ اس مثال کو ذرا آگے لے جایئے۔ ملک کی حکومت کو ہزاروں افراد، کارندوں، افسروں، مشیروں، سفیروں، وزیروں کی حیثیت سے لینے پڑتے ہیں۔ ان کے اس منصب یا فرائض مفوضہ کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں حکومت کے سینکڑوں سربستہ راز ان کے علم میں آتے ہیں۔ یہ راز ان کے علم میں اس لئے آتے ہیں کہ حکومت انہیں قابلِ اعتماد سمجھتی ہے۔

اب آپ ایک ایسے شخص کو لیجئے جسے حکومت کی مشینری کا پرزہ ہونے کی بنا پر حکومت کے سربستہ رازوں تک رسائی تھی۔ وہ کسی وجہ سے حکومت سے الگ ہو جاتا ہے اور پھر دھمکیاں دیتا پھرتا ہے کہ میں حکومت کا فلاں راز افشا کر دوں گا۔ فلاں بات بتا دوں گا۔ کہیئے کہ ضابطۂ امانت و دیانت کی رُو سے اس شخص کے کردار کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہوگا۔ اور ان لوگوں کے متعلق کیا رائے جو ایسی باتوں کے سننے میں مزہ لے رہے ہوں یا ان رازوں کو افشا کرنے کے لئے زور دے رہے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ضابطۂ اخلاق کی رُو سے یہی کہا جائے گا کہ یہ شخص قطعاً اس قابل نہیں کہ اس پر اعتماد اور اسے کسی رازداری میں شریک کیا جا سکے۔ کہا جائے گا کہ وہ معاملہ ایسا ہے جس سے ملک کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ فرض کیجئے اگر ایسا ہے تو جس بات سے ملک کو نقصان پہنچ چکا اس کے افشا سے اب فائدہ کیا ہے؟ اگر ملک کو اس نقصان سے بچانا مقصود تھا تو جب وہ معاملہ ہنوز زیرِ غور تھا، اس ہمدرد ملک و ملت کو چاہیئے تھا کہ حکومت سے الگ ہو کر قوم کو اصولی طور پر بتاتا کہ اس قسم کے معاملہ میں میرے خیال میں یوں ہونا چاہیئے۔ یعنی جو باتیں حکومت کی مشینری کا پرزہ ہونے کی بنا پر (IN CONFIDENCE) اس کے علم میں آئی تھیں، انہیں متعین طور پر اُس وقت بھی عام نہ کرتا بلکہ محض اصولی طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتا۔ ایسے شخص کو قابلِ اعتماد بھی کہا جائے گا اور ملک کا بہی خواہ بھی۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے اعتماد کو (EXPLOIT) کرتا ہے وہ قطعاً اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اس پر کسی معاملہ میں بھی اعتماد کیا جائے۔ قرآنِ کریم نے جب مومنین کے متعلق کہا تھا کہ عُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۲۳) وہ اپنی امانات اور عہد کی پاسداری کرتے ہیں تو اس سے صرف وہی امانات مقصود نہیں جو روپیہ پیسہ کی شکل میں ان کے پاس رکھی جائیں۔ اس میں ہر وہ بات شامل ہے جو کسی کے اعتماد پر اسکے سپرد کی جائے۔ اور رازہائے مملکت سے بڑی امانت اور کون سی ہو سکتی ہے؟

بزمِ مذاکرہ

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۶۹ء کی بزمِ مذاکرہ کے مقالات کی ایک قسط طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں شائع ہو چکی ہے۔ دوسری (اور آخری) قسط اب پیشِ خدمت ہے ۔۔۔! مذاکرہ کا عنوان تھا ۔۔۔ "جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی"

عزیزہ نوشابہ

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

ابتدائے آفرینش سے اب تک فکرِ انسانی نے جتنے بھی نظریہ ہائے حیات یا فلسفہ ہائے وجود تخلیق کئے ہیں اُن میں سے بیشتر انسان، کائنات، عمل اور سرگرمی کی نفی پر منتج ہوئے۔ وہ ہندوؤں کا دنیا کو فریب قرار دینا ہو یا افلاطون کی دنیائے تصورات ۔۔۔ اِن سب کی پیدا کردہ بے عملی نے روحِ حیات کو مسموم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی لیکن اسلام جو نوعِ انسانی کے لئے حیاتِ نو کا علمبردار ہے، خالقِ کائنات کا یہ پیغام لے کر آیا کہ ۔۔۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۔۔۔ ہم نے انسان کو محنت و مشقت کے لئے پیدا کیا۔ یعنی حیات و عمل کو لازم و ملزوم کر دیا۔ گویا

زندگی در جستجو پوشیدہ است!

قرآنِ پاک نے اس پیغام کو بار بار اور مختلف زاویوں سے اِس شد و مد سے دہرایا ہے کہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی فلسفۂ حیات، کوئی تصورِ ارتقاء "عمل" کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا ہر باب اور حیات کا ہر گوشہ سرگرمئ عمل کے بغیر نا تمام ہے۔ یہی بقائے حیات کا راز ہے کیونکہ یہی عمل یا بقول علامہ اقبال "تخلیقی عمل" ہی تھا جس کے تحت زندگی ایک بے حقیقت ابتداء سے مسجودِ ملائک آدم تک ارتقاء پذیر ہوئی اور اسی عمل کے زور پر یہ ٹوٹا ہوا تارہ "مہِ کامل" بننے کا متمنی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب تک یہ عمل محض ارتقائے

کائنات کا اصول رہتا ہے۔ اُس وقت تک یہ ایک ارتقائی عمل رہتا ہے ۔ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰) وہ یعنی عناصرِ کائنات اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے یعنی حیاتیاتی تقاضوں کی تکمیل کے لئے پوری پوری کوشش سے سرگرداں رہتے ہیں اور یوں عمل زندگی کے بقا کی ضمانت بنتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ زندگی اپنے عروج سے ہمکنار ہوتی ہے تو یہ بھی مقالِ عمل بن کر دوراہیں اختیار کرتا ہے۔ ایک خارجی عمل اور دوسرا داخلی عمل۔ یہ اس لئے کہ اس مقام پر زندگی خالص مادیت کی سطح سے بلند ہو کر روحانیت (انسانیت) کی سطح پر آجاتی ہے۔ اس کے تقاضے، ذمہ داریاں اور حقوق بڑھتے ہیں اور یہیں وہ فعالیت وجود میں آتی ہے جو انسانی آزادی اور اس کے اختیار کی پیداوار ہے۔ چنانچہ زندگی کی حقیقت میں یہاں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے، اُس کے تحت عمل کی کارفرمائی کی بھی دو راہیں بن جاتی ہیں کیونکہ یہاں زندگی کو محض حیاتیاتی تقاضے ہی پورے نہیں کرنے ہوتے بلکہ روحانی تقاضے بھی پورے کرنے ہوتے ہیں اور چونکہ قرآن پاک جسم اور روح کی ثنویت کو مٹا کر اُن کے تقاضوں کو باہم معاون بناتا ہے، اسلئے عمل یہ دونوں راہیں اختیار کرتا ہے۔

داخلی عمل سے مراد وہ عمل ہے جو مادی جسم کے اندر چھپے ہوئے انسان کی تکمیل کرے اور خارجی عمل کا مقصد عالم پر تصرف کا حصول ہے۔ اس داخلی عمل کو بڑی حد تک علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ خودی کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔ خودی سے یہ مراد ہے کہ انسان اپنی صلاحیت کو پہچانے، اپنی استعداد کو بیدار کرے اور جب اپنی صلاحیت و استعداد سے آگاہ ہو جائے تو اس استعداد کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے مصروفِ عمل ہو جائے اور عمل ہی کو اپنی زندگی سمجھے۔ اس تصور کے پس پردہ انسان کی حقیقت اور اس کے لاتعداد امکانات کا اعتراف پنہاں ہے اور اس کے عناصرِ ترکیبی میں آزادی، احترامِ نفس، ضبطِ نفس، اطاعت اور خودداری شامل ہیں اور یہ خودی یا شعور کا روشن نقطہ ایک ایسی خاموش قوت ہے جو ہر دم عمل کے لئے بیتاب ہے اور اُس وقت تک استحکام کی نئی منزلیں طے کرتی چلی جاتی ہے جب تک یہ اپنے لئے نئے مقتضیات اور عمل کی نئی راہیں تلاش کرتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ استحکام کی آخری منزل تک پہنچکر یہ تعلیماتِ قرآنی کا وہ شاہکار بن جاتی ہے جسے شاعرِ مشرق نے مردِ مومن کے لقب سے نوازا ہے۔

خودی کے باطنی، اخلاقی یا روحانی پہلو میں جو عمل کی کارفرمائی سے قطع نظر زندگی کے خارجی پہلو بھی ہیں جن کی فتح مندیوں کا انحصار بھی عمل پر ہی ہے۔ مسئلہ خواہ حیات مابعد الموت کا ہو، تکمیلِ ذات یا خودی کا ہو یا ٹھوس حقائقِ حیات ہوں یعنی زندگی مابعد الطبیعیاتی ہو یا طبیعیاتی، عمل ہر بازی گاہ میں یکساں طور پر فتح یاب ہے۔ ہر حال میں کسی ذوقِ تن کے زیرِ اثر حوادث و حالات کے سنگِ گراں کے خلاف انسان کا دفاعی ہتھیار عمل ہے جس کے تحت وہ اپنے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے اور پھر اُن کے حصول کے لئے سرگرمِ عمل ہو جاتا

ہے۔ اس جدوجہد سے نئے مقاصد جنم لیتے ہیں اور نئی راہوں کی نشاندہی ہوتی ہے جو سرگرمیٔ عمل کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے اور اس طرح انسان اعلےٰ سے اعلےٰ تر مقاصد کی طرف گامزن رہتا ہے اور ایسے ہی شمع عمل کے پروانوں کو مفسرِ قرآن ڈاکٹر اقبالؒ نے یہ بشارت دی ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!

لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے خبردار بھی کر دیا ہے کہ ابھی

تیرے عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

کیونکہ عمل کا انحصار ذوقِ تمنا کی بیتابیوں پر ہے۔ اگر یہ بے تابیاں رخصت ہو گئیں تو یہ نئی منزلیں بھی کھو جائینگی۔

یہ قوتِ عمل اگر داخلی طور پر انسان کو خالقِ کائنات کے دیئے ہوئے تصورِ اخلاق کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے استعمال ہوتی ہے تو خارجی طور پر خارجی عالم کو خود انسان کے تصورات کے سانچے میں ڈھال لینے کے کام بھی آتی ہے۔ اس طرح افلاطون کی طرح یہ بھی گویا ایک فلسفۂ تصوریت ہے جو روح و ذہن کے امکانات کے یقین پر منحصر ہے لیکن افلاطون کے برعکس یہ مادہ، روح کی ثنویت اور کائنات و تحریک و عمل کے اضداد پر مبنی نہیں ہے بلکہ جسم اور روح کی ہم آہنگی کے فلسفے سے اخذ ہو کر انسانی عمل کے لئے ذوقِ تمنا کی فراہمی کا سبب بنتی ہے۔ اب یہ ذوقِ تمنا قرآنی اخلاقی اقدار کے سانچے میں ڈھل جانا ہو یا اپنی دنیا کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لینا ہو۔ یہ تمنا کچھ بھی ہو، اس کے تصوراتی سانچے آتشِ شوق کو بھڑکانے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ جوئے شیر کا تصور ہی ہے جو تیشہ و سنگِ گراں کے تصادم کو دلوں کا نیگر بناتا ہے۔ یا اُس آتشِ شوق یا بقول علامہ اقبالؒ عشق کی بدولت ہے جسے قرآن کی زبان میں ایمانِ کامل کہا جاتا ہے۔ یعنی مقصد کی لگن یا حصولِ مقصد کے لئے والہانہ وارفتگی۔ سنگِ گراں کو توڑ دینے کا عزم اسی لگن پر منحصر ہے۔ یہ انسان کی قوتِ عمل کے لئے مہمیز ہے اور بلاشبہ

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی!
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

یا پھر بقول غالبؔ:۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اس پر اتنا زور دینے کا سبب یہ ہے کہ جوئے شیر، تیشہ اور سنگِ گراں کے درمیان وہ نقل جس سے زندگی کا تخیل واضح ہوتا ہے، اسی آتشِ شوق یا عشق پر مبنی ہے۔ اس آتشِ شوق کی بدولت وہ قوتِ عمل

جنم لیتی ہے جس کے سامنے رازہائے حیات آشکارا ہو جاتے ہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۵/۲۸)

تمہیں اپنے کاموں ہی کا بدلہ ملتا ہے۔

عمل ہر قوت، ہر طوفان کا مؤثر جواب ہے۔ اس کے دامن میں وقار و خودداری کی روایات پروان چڑھتی ہیں۔ اسی کے ہاتھوں میں قوموں کے عروج و زوال اور انسانیت کے ارتقار کی داستانیں لکھی گئی ہیں۔ اور یہی وہ قوت ہے جو آخر کار انسانیت کی معراج تک پہنچانے والی ہے۔

عمل کی کارگزاریاں اگر دیکھنی ہوں تو تاریخ کی شاہراہیں ہمارے سامنے ہیں جن پر انسانی عزم و عمل کے نقوش جگمگا رہے ہیں۔ افرو ایشیا میں غلامی کی ٹوٹتی ہوئی زنجیروں کی جھنجھناہٹ پکار پکار کر اُن نیک روحوں کے جوشِ عمل کی شہادت دے رہی ہے جن کے ذوقِ عمل سے ٹکرا کر یہ پاش پاش ہو گئیں۔ یہ عمل ہی کی کرشمہ سازی تو ہے کہ آج محبوبِ خدا کی امت کی نگاہیں بھی رہ رہ کر اُن آستانوں کی طرف اُٹھ رہی ہیں جنہیں کافر و ملحد قرار دیا جاتا ہے۔ یہی تو وہ جوہر ہے جس کی بدولت مارکس اور ماؤ کا بے بنیاد فلسفۂ زندگی نصف دنیا کو متاثر کر چکا ہے اور خالقِ کائنات کے اس ارشاد کی جیتی جاگتی شہادت بنتا جا رہا ہے۔

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ۔

بقارِ دوام صرف اسی نظام کو ہے جو بحیثیت مجموعی تمام نوعِ انسانی کے بہبود کیلئے ہے۔

وہ تو خیر ایک عظیم مقصد کے دعوے دار ہیں۔ عمل کی قوت تو اتنی تند و تیز اور اس قدر نتیجہ خیز ہے کہ اس جوہر سے ہر تمنا پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے، ہر آرزو شرمندۂ تعبیر ہو جاتی ہے خواہ وہ اچھی ہو یا بُری، حیات بخش ہو یا تباہ کن۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔۔۔ یا بہ تعبیر قرآن پاک کے الفاظ میں

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط (۲/۲۸۶)

جو اچھا کام کرے گا اس کا پھل اُسی کو ملے گا اور جو بُرا کام کرے گا اُس کا خمیازہ بھی وہی بھگتے گا۔

چنانچہ قرآن پاک کی تعلیمات کے بموجب عمل ہی کے ہاتھوں انسانوں کی تقدیریں بنتی بھی ہیں اور بگڑتی بھی ہیں لیکن ہمارے قلبِ حساس کی پہنچ بس یہیں تک ہے کہ جب بھی کوئی نیا المیہ جنم لیتا ہے تو آنکھوں کے راستے خونِ دل کے دریا بہانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ تقریروں، تقریبوں، کانفرنسوں اور قرار دادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن رباط کانفرنس سے لے کر دیہاتوں کی مسجدوں کے اجتماعات تک کے شرکا سے مجھے صرف ایک ہی سوال پوچھنا ہے اور وہ یہ ہے کہ کہاں ہے وہ ذوقِ عمل جس کے ہاتھوں

قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ کہاں ہے وہ جوشِ ایمانی جو مومن کو رمز آشنائے حیات بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تو مومنین کے بارے میں یہ ارشاد ہے ۔ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ (۹/۲۰)۔ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ہمیشہ جدوجہد کرتے ہیں اور اس کے لئے جہاں دولت صرف کرنی پڑے دولت صرف کرتے ہیں اور اگر جان بھی دینی پڑ جائے تو اس سے بھی گریز نہیں کرتے لیکن یہاں یہ جہد کا نفرنس ٹیبل سے آگے نادار دہے۔ قوم کا اجتماعی زوال ہماری غیرت کے لئے ایک چیلنج ہے۔ بڑھتی ہوئی سماجی برائیاں جو غلط نظامِ اقدار کی پیداوار ہیں 'غربت' جہالت' بدنظمی، اخلاقی انحطاط، سماجی گراوٹ اور سیاسی خلفشار' زبانِ حال سے ہمیں اپنی ذلت اور نامرادی کا احساس دلا رہی ہیں لیکن ہم اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کا محاذِ جنگ ہو یا ہمارے ایوان ہائے حکومت، سیاسی یا ملی تنظیموں کے دفاتر ہوں یا اقتصادی اور معاشرتی منصوبے۔ ہر مقام پر ہماری بے بسی' ناکامی ہماری بے عملی کا عبرتناک مظاہرہ ہے۔ آخر کیوں؟ جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے وہ تو ہمارے سامنے پچھلے ۲۰ سال سے تھے اور اب بھی ہیں۔ اسلامی معاشرہ کا قیام اقتصادی اور سیاسی استحکام، اخلاقی اور سماجی قدروں کا احیاء' انسانیت کے وسیع تر مفادات کا تحفظ۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے قوتِ بازو اور دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں ہماری قوم میں موجود ہیں لیکن پھر بھی عمل کے سوتے خشک ہیں جوئے شیر کا تصور بھی موجود ہے' تیشہ و سنگِ گراں بھی لیکن سنگِ گراں پر چوٹ کرنے کی تاب ہم کھو بیٹھے ہیں۔ شاید عقلِ مصلحت اندیش کی حیلہ جوئی یہاں بھی حائل ہے لیکن پھر بھی ہم اس موت کو زندگی قرار دیئے جاتے ہیں حالانکہ یہ زندگی موت سے بھی بدتر ہے جو لذتِ ناآشنائے عمل ہے۔

دور کیوں جایئے اقتصادی مسائل کے ہاتھوں ہم زخم کھاتے آئے ہیں۔ ہر دور میں ان مسائل نے ایک نیا المیہ تخلیق کیا۔ کبھی یہ دفاعی مشکلات کی صورت میں ظاہر ہوئے کبھی اقتصادی بحران بن گئے، کبھی غذائی قلت کا روپ دھارا اور اب یہ پسماندہ طبقوں کی اقتصادی بدحالی اور اضطراب کی صورت میں ملک کے امن و امان کو خاکستر کرنے پر تلے ہیں لیکن ماہرینِ اقتصادیات اور اربابِ بست و کشاد کے سامنے جو بھی اقدام رکھا جائے اس کا جواب کچھ اس قسم کا ملتا ہے۔ یہ چیز اقتصادی نظام کے تحت ممکن ہی نہیں، یا فلاں چیز کے لئے ہمارے پاس ایڈ نہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ دوسروں پر بھی بھروسا کرنے کا خیال چھوڑو اور اپنا کام آپ کرو تو اس کا جواب ہوگا۔ یوں تو اقتصادی ترقی کی رفتار سست ہو جائے گی۔ بھلا! کوئی یہ تو بتائے کہ اقتصادی ترقی کی رفتار آخر تیز کب ہو گی؟

اگر کوئی کہے کہ اس نظام کو ہی بدل دو جو تمہیں ہاتھ پاؤں نہیں ہلانے دیتا اور اسلامی نظام نافذ

کرو تو اس کا جواب ایک تذبذب، ایک خوف و ہراس اور ہچکچاہٹ ہوگا اور اس گومگو کے عالم میں ہم خالقِ کائنات کا یہ پیغام بھی بھول جاتے ہیں کہ ۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳/۱۵۹) ۔ اور جب تم عزم کر لو تو خدا پر بھروسہ کر کے اس فیصلے کو نافذ کر ڈالو۔ ہماری اس ادائے نیازی کو شاعرِ مشرق نے یوں مطعون کیا ہے ؎

وائے آں ملت کہ دونی ہمت می خواست
راہگذارے کہ در آو ہیچ خطر پیدا نیست

کم و بیش یہی حالت ہماری قومی اور ملی زندگی کے تمام شعبوں پر طاری ہے اور پھر ہم شکوہ سنج ہیں ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

(۱)

محترم محمد بشیر ظفر (ایم۔اے)

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

صدرِ محترم، خواتین و حضرات!

مادی تصورِ حیات کی رُو سے انسان طبعی جسم سے عبارت ہے جو طبعی قوانین کے مطابق وجود میں آتا ہے انہی قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل رہتا ہے اور بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔ انفرادی طور پر جسم کی پرورش طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ جو شخص ان کا اتباع کرتا ہے اس کی صحت ٹھیک رہتی ہے اور جو ایسا نہیں کرتا، بیمار پڑ جاتا ہے۔ امراض کا علاج بھی طبعی قوانین کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ جب قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں تو انسان مر جاتا ہے رہی اجتماعی زندگی تو اس کے لئے عقل و تجربہ کی روشنی میں قواعد و ضوابط مقرر کئے جا سکتے ہیں جن کے تحت معاشرے کی پرورش ہوتی ہے۔

چونکہ زندہ رہنے کے لئے مادی وسائلِ حیات کی فراہمی ضروری ہے لہٰذا ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ان وسائل کو اپنے قبضے میں کر لے۔ ظاہر ہے کہ اس مقابلے میں وہی کامیاب ہوگا جو زیادہ طاقتور ہو۔ افراد ہوں یا قومیں کمزوروں کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ استحصال کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر آئے گا۔ ہر دور میں چند

لوگ جنہوں نے کسی نہ کسی طرح دولت جمع کرلی تھی، باقی لوگوں پر حکومت کرتے رہے۔ انہیں تو زندگی کی تمام آسائشیں حاصل تھیں جبکہ باقی ان سے محروم تھے۔ اور چونکہ وہ کمزور تھے اسلئے انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ انہیں حاصل کرنے کے لئے آواز بھی اٹھا سکیں اور اگر کبھی کسی نے ایسا کیا بھی تو اسے سختی سے کچل دیا گیا۔

مادی تصور کے مقابلے میں دوسرے تصور کی رُو سے انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں، جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات، اَنَا یا خودی کہتے ہیں جس طرح انسانی جسم کی نشوونما طبعی قوانین کے اتباع سے ہوتی ہے، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگی سے ہوتی ہے۔ صفاتِ خداوندی ہمیں قرآن کے اندر تفصیل و وضاحت اور حسن و خوبی سے بیان کی ہوئی ملتی ہے۔ وہ ذات، جو یوں نشوونما حاصل کرلیتی ہے، زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ قرآن نے وہ ضابطہ بھی دیا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ذات کی نشوونما ہوسکتی ہے۔ اس ضابطے کے مطابق یہ نشوونما معاشرے کے اندر رہ کر ہی ہوسکتی ہے۔ وہ معاشرہ جو قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہو، اس معاشرہ میں حکمرانی کا حق کسی انسان یا انسانوں کے کسی گروہ کو تفویض نہیں کیا جاتا بلکہ سب ہی قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہیں۔ امیرالمومنین اس بات کا نگران ہوتا ہے کہ کوئی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہ جائے، چونکہ ہر ایک کی ضروریات کی ضمانت معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہوتا ہے لہذا اس سے ہر قسم کے استحصال کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس قسم کا معاشرہ متشکل کرنے کی کوشش کا مطلب ہر اُس طاقت سے ٹکر لینا ہے جس کی بنیاد استحصال پر ہو۔ اور ظاہر ہے کہ وہ افراد اور گروہ جنہوں نے صرف دوسروں کی محنت پر زندہ رہنا سیکھا ہو اسے کسی صورت برداشت نہیں کرسکتے۔ آج سے چودہ صدیاں قبل جب عرب کے ریگزاروں میں محمد الرسول اللہ والذین معہ کے ہاتھوں اس معاشرہ کو متشکل کرنے کی ابتداء ہوئی تو استحصال پسند گروہ نے جس طرح انکی مخالفت کی، تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اُن پر مصائب کے پہاڑ توڑے گئے، انہیں استہزاء کا نشانہ بنایا گیا، پتھریلی زمین میں پاؤں میں رسی باندھ کر انہیں گھسیٹا گیا، غرض ہر طرح کے ظلم و جور سے انہیں مجبور کردیا گیا کہ وہ وہاں سے دو سو میل دور چلے جائیں اور جب وہاں اُن کی کوششیں برگ و بار لانے لگیں تو ان پر اپنے تمام وسائل سمیت بار بار لشکرکشی کی گئی۔ مگر صبر و استقلال کے وہ پیکر مردانہ وار آگے بڑھتے رہے تاآنکہ وہ معاشرہ وجود پا گیا جس میں خالص قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہوا۔ انسانی تاریخ کا ایک منفرد معاشرہ جس میں ہر ایک کو اپنی ذات کے نشوونما کے برابر مواقع میسر آسکے، وہ معاشرہ جس نے تاریخ کو حضرت عمرؓ سا مثالی حکمران دیا جو اپنی ذمہ داریوں کو یوں محسوس کرتا تھا کہ پکار اٹھتا۔

"خدا کی قسم اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے
مرگیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔"

وہ معاشرہ جس میں قانون کا احترام اس قدر تھا کہ اگر کوئی جرم سرزد ہوجاتا تو مجرم خود عدالت سے اس کی سزا طلب کرتا جس کے جوانان صف شکن میدان جنگ و تازمیں کو دے تو کائناتی قوتیں ان کے دست و بازو بن گئیں۔

یہی وہ معاشرہ تھا جس کو متشکل کرنے کی تڑپ اسلامیان برصغیر کے دل میں پیدا ہوئی تو ۱۹۴۷ء میں دنیا کے نقشے پر پاکستان نام کی نئی مملکت وجود میں آئی۔ اس مملکت کو حاصل کرنے کے لئے قوم کو آگ اور خون کے دریا عبور کرنے پڑے اس کے لئے انہوں نے بے شمار قربانیاں دیں۔

قیام پاکستان کو بائیس سال ہوچکے۔ ایک نسل ختم ہوئی، دوسری پروان چڑھ چکی، مگر افسوس کہ ہم آج بھی منزل سے کوسوں دور ہیں۔ اُس وقت تو اس کے نقوش نظر آرہے تھے، مگر اب وہ بھی دھندلا گئے ہیں۔ نئی نسل سوچتی ہے، ہماری منزل کہاں ہے؟

ملک کے حالات پر نظر ڈالیں تو مایوسی کی ایک لہر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ قوم کا وہ جوش و خروش سرد پڑگیا ہے جو تحریک پاکستان کے دنوں میں تھا۔ وہ لوگ جو قوم کے راہ نما کہلانے کے مدعی ہیں۔ اُسے اس منظر سے دور لئے جارہے ہیں، مغرب کی طرف یا مشرق کی طرف۔ مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے چرچے ہیں، یا اشتراکیت، مگر لیبل اسلام کا ہے۔ جمہوریت، جمہوریت کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہم بائیس سال جمہوریت کے نت نئے تجربے کررہے ہیں، ہر ایک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ قوم کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ قوم کیا ہے اور اس کا مزاج کیا ہے، شاید کوئی نہیں جانتا یا وہ جاننا ہی نہیں چاہتے۔ بس یہی آواز ہے ــــ جمہوریت آلینے دو، قوم کے سب دکھ دور ہوجائیں گے اور یہ اسفل السافلین سے نکل کر اوج ثریا کو پہنچ جائے گی۔ ملک کے دس کروڑ عوام کی ضروریات زندگی پوری ہوجائیں گی۔ بس ان کے ہاتھ میں ووٹ دے دو، سارے مسئلے حل ہوجائیں گے۔

کیا واقعی ان کی ضروریات پوری ہوجائیں گی؟ یا یوں تو نہیں کہ ایک خاص طبقہ جو پہلے ہی سیاہ و سفید کا مالک ہے ــــ مجلس آئین و اصلاح و رعایت حقوق کے پردے میں اپنی جنگ زرگری کا سامان کرنا چاہتا ہے۔ اور دست دولت آفریں کو صرف زکوٰۃ پر ہی گزارہ کرنا ہوگا۔ قوم سوچتی ہے کہ یہ ہمیں عدل و احسان کے حامل معاشرے کی طرف کیوں نہیں بلاتے، جس کا مژدہ ہمیں قائد سالار نے سنایا تھا۔ کتنی سادہ لوح ہے یہ قوم!

بھلا وہ اس طرف بلائیں گے ہی کیوں؛ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے والے کو دانشمند تو نہیں کہتے،

یہ معاشرہ تو ان کے لئے پیغامِ موت ثابت ہوگا اور وہ ابھی مرنا نہیں چاہتے۔ قوم کے لئے سرمایہ دارانہ جمہوریت کیسی رہے گی؟ یہ ٹھیک نہیں تو پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کے متعلق کیا خیال ہے۔ رہے وہ، ان کے تو دونوں ہی میں مزے ہیں۔

مایوسی کی ان اتھاہ تاریکیوں میں امید کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ ایک طرف سے خالص قرآن کی آواز بلند ہو رہی ہے، قرآنی معاشرہ کی نشاۃ ثانیہ کی نوید، فردوسِ گم گشتہ کو پا لینے کی آرزو، جس میں نہ پیاس ستاتی ہے نہ بھوک کا خوف ہے۔ سردی کی شدت ہے نہ گرمی کی۔ جہاں کوئی خوف و حزن نہیں جس میں انسان کی انسان ہونے کی جہت سے عزت ہوتی ہے، بڑائی کا معیار دولت نہیں تقویٰ ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے بھرپور مواقع ہیں۔

اگرچہ وہ گروہ جن کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے، آپس میں بھی دست و گریباں ہیں مگر اس طرف سے غافل ہرگز نہیں۔ وہ پورا زور لگا رہے ہیں کہ یہ آواز بند ہو جائے۔ ہمیشہ سے سرمایہ داری کا حامی مذہبی پیشوائیت کا گروہ اپنے تمام ہامانہ ہتھکنڈوں سمیت ان کی مدد کو میدان میں کود پڑا ہے اور یوں قرآن کو مشرف بہ سرمایہ داری کرنے کی سعیٔ لاحاصل کی جا رہی ہے۔

اس معاشرے کی تشکیل کی راہ میں یہ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے جو بُت سنگِ گراں بن کر حائل ہیں، آئیے ان کو ضربِ کلیمی سے پاش پاش کر دیں۔ منزل سامنے ہے۔ دشواریاں تو آئیں گی، اگر ثابت قدمی سے چلتے رہے تو وہاں ضرور پہنچیں گے کہ سنگِ گراں کا سینہ چیر کر جوئے شیر لانا ہی اصل زندگی ہے۔

—— (۰) ——

محترمہ عارفہ سلطانہ

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!

(مذاکرہ میں برجستہ تقریر کی لیکن بعد میں اسے اشاعت کے لئے ازسرِنو مرتب کیا)

محترمہ صدرِ بزم۔ میرے عزیز بھائیو اور بہنو! —— دائم شگفتہ باد!

اکثر دیکھا گیا ہے کہ فطرت اپنی کرم گستری اور فیض بخشی میں بڑی بخیل واقع ہوئی ہے۔ اگر وہ کسی کو حسین پیکر عطا کرتی ہے تو معنوی خوبیوں کی طرف سے ہاتھ روک لیتی ہے جس کی جھولیاں زر و جواہر سے بھر دیتی ہے اسے حسنِ لطیف سے محروم رکھتی ہے۔ جسے فکر کی بلندیاں عطا کرتی ہے اُسے ذوقِ سلیم سے

بہت کم حصہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلاسفرز میں بالعموم شعریت کا فقدان ہوتا ہے اور شاعر کی آنکھ دنیائے ممکنات کی طرف سے بند ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات "وہی بخیل فطرت" یوں کہیئے کہ ترنگ میں آجاتی ہے تو اسکی کیفیت یہ ہوتی ہے ـــــ کہ شعلہ شعلہ بہ بخشد، شرر شرر نہ دہد!

اقبالؒ کی انفرادیت

علامہ اقبالؒ کے معاملہ میں فطرت کچھ ایسی ہی پیمانہ فراموش واقع ہوئی تھی۔ فکر کی دنیا میں دیکھئے تو ان کا شمار دنیا کے بلند ترین مفکرین میں ہوتا ہے ـــــ بلکہ بعض گوشوں میں تو متقدمین اور متاخرین میں سے کوئی بھی ان کا ہمدوش نظر نہیں آتا ـــــ اور اس کے ساتھ، اظہارِ بیان کی طرف آیئے تو دنیا کی بلند اور نازک ترین شاعری انہیں رشک کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ میں فلسفہ اور قرآن کی طالب ہوں، اس لئے میں نے جب اقبالؒ کی اس انفرادیت پر غور کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی یہ سب نتیجہ تھا قرآنِ مجید پر اسکے گہرے غور و تدبر کا۔ قرآن خود بلند ترین حقائق اور حسین ترین اندازِ بیان کا بے مثال امتزاج ہے اور اقبالؒ کی یہ خصوصیت اسی چشمۂ فیض کی رہینِ منت ہے ـــــ یہ وہ بارگاہ ہے جہاں سے ـــــ مانگنے والے کو دنیا بھی نئی ملتی ہے ـــــ ہمارے آج کے مذاکرہ کا عنوان ـــــ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی ـــــ اقبالؒ کی رفعتِ فکر اور لطافتِ بیان کے اسی حسین امتزاج کا پیکر ہے۔ حقائق کی طرف آیئے تو اس نے "زندگی کی حقیقت" کو تین لفظوں میں اس طرح سمو کر رکھ دیا ہے کہ نگہ بصیرت اس پر وجد کرتی ہے۔ اور اندازِ بیان کی طرف دیکھئے تو ـــــ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است ـــــ میں آج کی نشست میں انہی تین الفاظ کا تجزیہ پیش کرنا چاہتی ہوں جن سے زندگانی عبارت ہے ـــــ لیکن زندگانی کس کی؟ کوہکن کی ـــــ

مصرعہ اقبالؒ کے اس اقنومِ ثلاثہ میں سب سے پہلے ہمارے سامنے "جوئے شیر" کا تصور آتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسے آنا بھی سب سے پہلے چاہیئے۔ تعینِ مقصد ہر رہروِ حیات کے لئے قدمِ اول ہے۔ سفر اور

تعینِ مقصد کی اہمیت

آوارگی میں فرق ہی یہ ہے کہ مسافر منزل کے تعین کے بعد قدم اٹھاتا ہے اور آوارہ بلا تعینِ منزل چلتا رہتا ہے۔ سارا دن چلنے کے بعد تھکتے دونوں ہیں ـــــ لیکن مسافر کی تکان اسے منزل سے قریب تر لے آنے کی وجہ سے اس میں تجدیدِ سفر کے لئے تازہ ولولے پیدا کر دیتی ہے اور آوارگی کی تکان سے سوائے اضمحلال، افسردگی اور یاس و ناامیدی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن کریم بلا تعینِ مقصد، تگ و تاز کرنے والوں کے متعلق کہتا ہے کہ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ۔ ان کے اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ ان کی محنت ثمر بار نہیں ہوتی۔ یعنی وہ محنت کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے سامنے کوئی متعین مقصد نہیں ہوتا اس لئے ان کی سعی و کاوش نتیجہ خیز نہیں ہوتی ـــــ و

ذَالِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ" — اور یہ بہت ہی بڑا خسارہ ہے — یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید تعینِ مقصد کو اعمالِ انسانی کی بنیادی اینٹ قرار دیتا ہے۔ تعینِ مقصد کو اس کی اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمان، عزیزانِ من! چار الفاظ دہرا لینے کا نام نہیں۔ یہ سفرِ حیات میں یقینِ منزل کا نام ہے۔ وہ منزل کیا ہے جس کا تعین قرآن نے کیا ہے، یہ موضوع تفصیل طلب ہے اور عنوانِ مذاکرہ سے الگ۔ اس لئے میں اس وقت اس وادی میں گامزن نہیں ہونا چاہتی۔ یہاں سے میں صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتی ہوں کہ یہ منزل ہے — لاالٰہ الا اللہ — یعنی دنیا کی ہر آستاں سے سرفرازانہ انداز سے بیباکانہ گذر کر صرف خدا کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا — (اس سے ہوتا کیا ہے، اس کے متعلق میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گی)۔ اس مقصد کی نشاندہی کے لئے اس نے ہمارے لئے ایک محسوس مرکز مقرر کیا۔ جسے کعبہ کہا جاتا ہے۔ اور کعبہ کے متعلق کہا کہ وہ تمہارا قبلہ ہے — قبلہ کے معنی ہوتے ہیں وہ شے جو ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے — مسافر وہی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے، منزل کا تصور جس کی نگاہوں کے سامنے ہر وقت رہے۔ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ — تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنی توجہات کو اسی کی طرف مرکوز رکھو — اقبالؒ نے اسی لئے امتِ مسلمہ کے متعلق کہا ہے کہ

پرد در وسعتِ گردوں بیگانہ
نگاہِ او بہ شاخِ آشیانہ

ہمارا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید انسانی زندگی کے لئے جو راہنمائی پیش کرتا ہے، اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ آیئے ہم سب سے پہلے دیکھیں کہ خود مقصد کے تعین میں، وہ کس طرح، باقی دنیا کے تصورات سے منفرد اور یگانہ ہے۔

مقصدِ حیات دنیا کے مذاہب میں

آپ دنیا کے کسی مذہب کو لیجئے، اس میں مقصدِ زندگی بتایا جائے گا — نجات — نجات کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس دنیا میں مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لینا نجات ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان، اپنی موجودہ شکل میں آنے سے پہلے، آزاد تھا۔ دنیا میں آیا تو ترغیباتِ دنیا کے مختلف پھندوں میں پھنس کر آواگون کے لامتناہی چکر میں الجھ گیا۔ اب اس کے لئے ایک جنم کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے — اور اس طرح ہزاروں، لاکھوں، کروروں جنموں کے بعد یہ ممکن ہوگا کہ وہ پھر ویسا ہی ہو جائے جیسا وہ پہلے تھا۔ اسے مکتی یا نجات کہتے ہیں۔

عیسائیوں نے کہا کہ بچہ پیدائش سے پہلے تو معصوم ہوتا ہے لیکن پیدائش کے ساتھ وہ اپنے اولین ماں باپ ـــ آدم و حوا ـــ کے گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے دنیا میں آتا ہے۔ گناہ کے اس داغ کے دھلنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے حضرت مسیح (علیہ السلام) کی صلیب اور کفارہ پر ایمان ـــ اس سے انسان پھر ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا وہ پیدا ہونے سے پہلے تھا۔ اسے کہتے ہیں (SALVATION) یا نجات۔

یہودیوں نے کہا کہ نوعِ انسان بلکہ جنت میں جانے کے مستحق صرف بنی اسرائیل ہیں۔ لیکن ان کے آباؤ اجداد نے سبت کے حکم سے سرتابی برتی تو اس کی پاداش میں بنی اسرائیل اتنے وقت کے لئے جہنم میں چلے جائیں گے جب تک ان کی شفاعت کرنے والے خدا سے اس معاملہ کو صاف نہ کرا لیں۔ ان کے جہنم سے نکل کر پھر معصوم ہو جانے کا نام نجات ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ مذہب کی دنیا میں مقصدِ حیات ہے نجات اور نجات سے مراد ہے انسان کا پھر سے ویسا ہو جانا جیسا وہ پہلے تھا۔ یعنی اس کا (AS YOU WERE) ہو جانا۔ اس کا صحیح مفہوم

نجات کی بے مقصدی

سامنے لانے کے لئے مجھے ایک حکایت یاد آگئی ـــ ایک مرد، اس کی بیوی اور بیٹا سفر میں جا رہے تھے۔ بیوی بدصورت سی عورت تھی۔ راستے میں کوئی درویش ملے جن کی انہوں نے بڑی خدمت کی تو اس نے ان سے کہا کہ جاؤ۔ تم میں سے ہر ایک کی ایک ایک دعا زندگی میں مقبول ہو جائے گی۔ اس پر سب سے پہلے اس عورت نے خدا سے دعا مانگی کہ مجھے پریوں جیسا حسن مل جائے۔ تو وہ پری تمثال بن گئی۔ اتفاق سے ایک امیرزادہ اُدھر سے شکار کرتا ہوا آ نکلا۔ اس نے دیکھا کہ اس قسم کے دیہاتیوں کے ساتھ ایسی حسین عورت جا رہی ہے۔ اس نے اُسے اٹھایا اور اپنے گھوڑے کے پیچھے بٹھا لیا۔ عورت بھی خوش ہوئی کہ وہ ایک امیرزادہ کے ہاں چلی جائے گی۔ اس کے خاوند کو اس پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے دعا کی کہ یا اللہ! اس عورت کی شکل سورنی جیسی ہو جائے۔ چنانچہ اس کی شکل ایسی ہی ہو گئی۔ اس امیرزادہ نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ اس نے سمجھا کہ وہ عورت نہیں، کوئی چڑیل ہے۔ فوراً اسے دھکا دے کر نیچے گرا دیا اور آپ چلتا بنا۔ لڑکے کی دعا باقی تھی۔ اس نے جب ماں کی یہ حالت دیکھی تو خدا سے کہا کہ اس کی ماں کی شکل پھر پہلے جیسی ہو جائے۔ چنانچہ وہ پہلی عورت ہو گئی اور یہ تینوں اپنی دعائیں پوری ہو جانے کے بعد پھر ویسے کے ویسے راستہ طے کرنے لگ گئے ـــ اسے کہتے ہیں عزیزانِ گرامی قدر ـــ نجات! سوچئے کہ یہ بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کے لئے انسان کو تگنی کرنا پڑے! اور پھر اس خدا کے متعلق آپ کیا کہیں گے جس نے (ان مذاہب کے عقیدہ کے مطابق) اس قسم کی بے نتیجہ تگ و دو کو مقصدِ زندگی قرار دے دیا۔ ایسا بے معنی مقصد ـــ

می نہ سزد خدائے را!

اہلِ معرفت کے نزدیک مقصدِ حیات

اہلِ معرفت نے کہا کہ مذہب والوں کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ اس لئے وہ انسانی زندگی کا مقصد پا نہیں سکے۔ اصل یہ ہے کہ خود انسان کا وجود ہی ایک شر ہے۔ جب تک یہ نہیں مٹتا، شر رفع نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا، انسانی زندگی کا مقصد فنائے ذات (یا فنائے نفس) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی رہ رہ کر ٹھنڈی سانس بھرتا، اور باصد حسرت و یاس، پکار اٹھتا ہے کہ

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

اس کے نزدیک عشرتِ قطرہ، دریا میں فنا ہو جانے کا نام ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو صوفی، ہر وقت خدا سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ خدا ہر آن، انسان پیدا کرتا رہتا ہے اور صوفی، جنگلوں، بیابانوں میں مارا مارا پھرتا، یا زاویوں اور خانقاہوں میں چلّے کاٹتا ہے کہ کسی طرح انسان کی ذات فنا ہو جائے ــــ وہ پیدا کرتا رہتا ہے، یہ اُسے فنا کرنے کی فکر میں مصروفِ تگ و تاز رہتا ہے اور جب بیاس طرح (بزعمِ خویش) انسانی ذات کو فنا کر کے، خدا کو (معاذ اللہ) شکست دے دیتا ہے تو جشنِ مسرت مناتا اور چراغاں کرتا ہے، اور ببانگِ دہل (یا طبلے کی تھاپ پر) کہتا ہے کہ ــــ شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم! یہ ہے اہلِ تصوف کے نزدیک مقصدِ حیات۔ یعنی ساری کوہ کنی اور خارہ شگافی اسلئے کہ جوئے شیر کا نام و نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ اُس کا ہر تیشہ جوئے حیات کو ندی سے جوہڑ بنانے، اور بالآخر اُسے خشک کر دینے کے کام آتا ہے۔

مادہ پرستوں کے نزدیک

عصرِ حاضر کے مادہ پرستوں نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے کہا کہ جب مقصدِ حیات انسان کا مٹ جانا ہی ہے، تو اس کے لئے اس قدر کوہ کنی اور خارہ شگافی کی ضرورت کیا ہے۔ آپ سیدھی طرح سے کیوں نہیں تسلیم کرتے کہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ زندگی، طبعی قوانین کی رُو سے، کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئی اور مختلف منازل طے کر کے اس نے پیکر اختیار کر لیا۔ اب جس وقت یہ پیکر، طبعی قوانین کے مطابق، اپنی توانائی کھو بیٹھے گا، انسان پر موت طاری ہو جائے گی اور یوں اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چکبست کے الفاظ میں:

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا!

لہٰذا، زندگی کا مقصد یہ ہے کہ "کھاؤ۔ پیو اور مزے سے دن گزارو"

آپ نے غور فرمایا، عزیزانِ من! کہ عصرِ حاضر کی مادیت پرستی اور تصوف کا وحدتِ وجود کس طرح اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ صوفی اپنے آپ کو فنا کرتا ہے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر، اور مادہ پرست اپنے آپ کو ختم کرتا ہے مادی عیش پرستیوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد۔ تصوف اور مادہ پرستی کی یہی یگانگت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شپنؔ نے کہا تھا کہ "وحدتِ وجود، مادہ پرستی پر تھوڑا سا جذباتی رنگ چڑھا دینے کا نام ہے۔"

قرآنی تصوّر

یہ ہیں زندگی کے مقاصد دنیا کے مذہب، جہانِ طریقت اور عام مادیت کے نزدیک۔ اس کے برعکس، قرآن کو دیکھئے تو اس نے ان سب سے الگ اور منفرد مقصدِ حیات پیش کیا جس نے خود حیات کو ایک نئی تعبیر عطا کر دی۔ اس نے کہا کہ یہ کارگہِ کائنات بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا۔ اسے خدا نے بالحق — یعنی ایک ٹھوس تعمیری مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کا مستقبل اس کے اعمالِ حیات کے مطابق تعمیر کیا جا سکے۔ جہاں تک انسانی زندگی کا تعلق ہے، اس کی موجودہ سطح بے شک طبیعی سلسلۂ ارتقار کی آخری کڑی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کی زندگی کا ایک اور ارتقائی سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کی پہلی کڑی اس کی موجودہ منزل ہے۔ یہ ارتقار انسانی جسم کا نہیں، بلکہ اس کی ذات کا ہوگا۔ اس کی ذات میں لامنتہیٰ ممکنات مضمر کر کے رکھ دی گئی ہیں اور اس کا کام یہ ہے کہ وہ ان مضمر صلاحیتوں کو بارز اور مشہود کرے۔ اسی سے اس کی ذات کی ایسی نشو و نما ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کی اگلی منازل طے کرنے کے قابل بن جاتی ہے۔ موت سے انسان کا پیکرِ خاکی منتشر ہو جاتا ہے لیکن اس کی نشو و نما یافتہ ذات آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس کے اس طرح آگے بڑھنے کی منزلیں لامحدود ہیں حتیٰ کہ جسے جنت کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ بھی اس کی آخری منزل نہیں — راستے میں سستانے کا مقام ہے جس طرح بربط کے تاروں میں خوابیدہ نغمے مضراب سے بیدار ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی ذات کی مضمر صلاحیتیں ٹکراؤ سے مشہود ہوتی ہیں۔ یہ ٹکراؤ ہوتا ہے ان موانعات سے جنہیں اقبالؔ نے جوئے شیر کے راستے میں حائل سنگہائے گراں سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کو قرآن، کشمکشِ ابلیس و آدم کہہ کر پکارتا ہے جس سے ہم اپنے موضوع کی اگلی منزل میں داخل ہوتے ہیں۔

مسئلہ خیر و شر

جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے، خیر و شر کا مسئلہ اس کے لئے وجۂ دردِ سر ہی نہیں، باعثِ سوہانِ روح بھی بنے چلا آ رہا ہے۔ فلاسفر اس مسئلہ کو سینٹ تھامس کے اس معمہ کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ

اگر شر خدا کی مرضی سے موجود ہے تو خدا خیرِ مطلق نہیں اور اگر وہ اس کی مرضی کے علی الرغم موجود ہے تو خدا قادرِ مطلق نہیں۔

انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق جتنا کچھ لکھا ہے اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا لیکن کیفیت یہ ہے کہ وہ جوں جوں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ اسی قدر اور الجھتی چلی جاتی ہے۔

قرآن مجید نے اس مسئلہ کو اس طرح پیش کیا کہ یہ حل طلب مسئلہ ہی نہ رہا۔ اس نے کہا کہ جسے تم شر قرار دیتے ہو، وہ تمہارے جذبہ مرعوبیت یا احساسِ کمتری کی وجہ سے ایسا نظر آتا ہے۔ ورنہ شر، درحقیقت شر ہوتا ہی نہیں۔ کائنات کی ہر شے کے جوہرِ خفتہ کی نمود، اس کے متضاد عنصر کے ساتھ تصادم سے ہوتی ہے۔ جو شے اس عنصر سے شکست کھا جاتی ہے، وہ اس کے حق میں شر بن جاتا ہے۔ جو اس پر غالب آجاتی ہے، اس کے لئے وہ ابھرنے اور آگے بڑھنے کا ذریعہ، فلہذا خیر قرار پاتا ہے۔ اس تضاد و تزاحم کے بغیر انسانی ذات کی ممکنات کی نمود کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے، اس کے ساتھ اس کا وجود ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقِ انسانی کے ڈرامے میں جب پہلا پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج پر آدم کے ساتھ ابلیس بھی کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اور (قرآن کے بیان کے مطابق) وہ آخری انسان تک، اس کے ساتھ موجود رہیگا۔ ابلیس کسی شخصیت کا نام نہیں۔ قوتِ تصادم کا نام ہے۔ اس تصادم سے کیا ہوتا ہے، اس کا نظارہ آپ ابھی ابھی کر کے آئے ہیں۔ آپ جب طلوعِ اسلام کالج کی زمین دیکھنے گئے تھے تو آپ کے راستے کے ساتھ ساتھ، سامنے کی نہر بہے جا رہی تھی — نہایت خاموش، پُرسکوت، سُست رفتار۔ فیروز پور روڈ کے پُل کے بعد آپ نے دیکھا ہوگا کہ نہر، پتھروں کے بند کے ساتھ ٹکرائی۔ اسے ٹھوکر یا (WALL) کہتے ہیں۔ اس ٹکراؤ سے ایک شور اٹھا۔ موجوں میں تلاطم برپا ہوا۔ اور اس کے بعد جو دیکھتے ہیں کہ اس نہر کی رفتار میں کہیں زیادہ تیزی پیدا ہو گئی۔ نہریں، انہی ٹھوکروں کی بدولت، اپنی آخری منزل تک پہنچتی ہیں۔ یہ نہ ہوں تو وہ راستے ہی میں دم توڑ کر بیٹھ جائیں۔ لیکن اس ٹکراؤ سے اُسی نہر کی روانی میں تیزی آتی ہے جس میں، پتھروں کی اس دیوار کو اُلانگ جانے کی قوت ہو۔ جس میں اس قدر توانائی نہ ہو، یہی پتھر اس کے لئے دیوارِ زنداں بن جاتے ہیں اور وہ نہر، جوئے رواں سے، جوہڑ بن کر رہ جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس سے خیر اور شر کا مسئلہ کس حسن و خوبی سے حل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نمود اور ارتقار کے لئے

مقامِ ابلیس

ابلیس کا وجود ناگزیر ہے۔ اسی سے انسان اپنی توانائیوں کا امتحان کر سکتا ہے — جتنی ایک فرد کی توانائیاں بڑھتی جائیں گی، اتنی ہی زیادہ شدید قوتوں کا مالک ابلیس اس کے مقابلہ کے لئے درکار ہوگا — گلبرگ کی جوئے نغمہ خواں کے لئے اور قسم کی ٹھوکر۔ اپر چناب کے لئے اور قسم کی ٹھوکر — اور جس نہر کے راستے میں کوئی بھی ٹھوکر نہ ہو، وہ حرکت سے عاری جھیل — یہی وہ حقیقت

ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

اگر آپ اس نقطۂ نگاہ سے ملٹن کے تصورِ ابلیس کا مقابلہ اقبالؒ کے تصورِ ابلیس سے کریں تو آپ کو عیسائیت کے تصورِ سفر اور قرآن کے تصورِ ابلیس میں نمایاں فرق نظر آجائے گا۔ ملٹن کا شیطان، جہنم سے ڈر کر منہ چھپائے مارا مارا پھرتا ہے۔ اقبالؒ کا شیطان، پوری جرأت و بے باکی سے کہتا ہے کہ ــــ میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح ــــ یہ ابلیس، جلال و جبروت کا پیکر ہے۔ اسی لئے جب یہ خدا کے سامنے آدمؑ کو چیلنج دیتا ہے تو بِعِزَّتِكَ کہہ کر دیتا ہے۔ یعنی تیرے جلال و جبروت کی قسم، میں اس مٹی کے پتلے اس خاک کے تودے کو ملیا میٹ کر کے چھوڑوں گا۔

کاروانِ انسانیت کے راستے میں، ابلیس کے گاڑے ہوئے پتھر قدم قدم پر ملتے ہیں۔ ان کی شکل و صورت مختلف ہے لیکن روحِ ابلیسی ایک ہی کارفرما ہے۔ قلتِ وقت کے باعث میں ان پیکروں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتی۔ قرآنِ مجید میں جہاں جہاں "يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ" آیا ہے ــــ یعنی خدا کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہونے والے ــــ وہاں آپ ان کی تفاصیل دیکھ سکتے ہیں۔ میں اس وقت ان شیاطین کی صرف دو ایک اقسام کا تعارف کرانا کافی سمجھتی ہوں ــــ یہ شیطان وہ نہیں جنہیں ہمارے حاجی صدیوں سے پتھر مارتے چلے آرہے ہیں لیکن وہ اپنے مقام پر اسی طرح جیسے کھڑے ہیں ــــ یہ وہ شیاطین ہیں جو کاروانِ انسانیت کی راہ روکے کھڑے رہتے ہیں لیکن مردِ مومن کی ایک نگہ جلال آمیز کی تاب نہیں لا سکتے۔

شیاطین کا تعارف

سب سے پہلے قرآن مجید نے ظالمین کے متعلق کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۱۱/۱۹)۔ یہ لوگ خدا کی طرف لے جانے والی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل رہتے ہیں۔ ظلم میں ہر قسم کی دھاندلی، غضب و نہب اور (EXPLOITATION) آجاتی ہے۔ دوسری قسم ان سرمایہ داروں کی ہے جو خود تو سامنے آنے کی جرأت نہیں رکھتے لیکن اس مقصد کے لئے پانی کی طرح روپیہ بہاتے رہتے ہیں۔ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۸/۳۶)۔ اور تیسری قسم مذہبی پیشواؤں کی ہے جو لوگوں کا مال بطریقِ حرام کھاتے ہیں اور خدا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر حائل رہتے ہیں ــــ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۹/۳۴)۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، ابلیس کا وجود انسانی ارتقاء کے لئے ناگزیر ہے۔ اس لئے اسے

سٹا دینے اور ختم کر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر اس کے ساتھ سلوک کیا کیا جائے! اس باب میں ہمارے سامنے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسا ارشادِ گرامی آتا ہے جس سے نگاہوں میں چمک اور روح میں وجد پیدا ہوتا ہے۔ اور میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ دنیائے مذاہب اور جہانِ فلسفہ دونوں میں، اس کی نظیر کہیں نہیں مل سکیگی۔ یہ ایک ایسا عظیم خیال ہے جس سے حضورؐ کی عظمت جگمگ جگمگ کرتی سامنے آجاتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا

ابلیس کا علاج

کہ ہر انسان کا ایک ابلیس ہوتا ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ کیا آپ کا بھی ابلیس ہے؟ فرمایا کہ ہاں! ہے۔ اور اس کے بعد آپؐ نے وہ الفاظ ارشاد فرمائے جن کی مثال (جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے) کہیں نہیں مل سکتی۔ آپؐ نے فرمایا۔

میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیا ہے۔

عزیزانِ گرامی قدر! یہ ہے مسئلہ خیر و شر کا وہ حل جسے نہ نکتہ ور پا سکے اور نہ دیدہ ور تلاش کر سکے ـــــ متصادم قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے تابع لاکر مغلوب کر لینا ـــــ یہ ہے حصولِ مقصد کا واحد اور حقیقی ذریعہ ـــــ صوفی ابلیس (نفسِ امارہ) کو مارنے کی سعیِ لاحاصل میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔ یہ درحقیقت کشمکشِ زندگی سے فرار ہے۔ اس سے ابلیس تو کیا مریگا، اس مارنے والے پر خود موت طاری ہو جاتی ہے۔ اور ابلیسی قوتیں بے لگام ہو کر رہزنِ دین و دانش بن جاتی ہیں۔ دوسری طرف مادہ پرست ہے جو ابلیس کا ندیم (ہم نوالہ و ہم پیالہ) بنکر اس کے جنود میں اضافہ کرتا ہے اور یوں زندگی کو بے مقصد قرار دے کر حقائق کا سامنا کرنے سے جی چراتا ہے۔ لیکن کوہکن (مردِ مومن) ان دونوں کے برعکس ہاتھ

تیشۂ کوہکن

میں تیشہ لیکر اٹھتا ہے اور پتھروں کو اس انداز سے تراشتا ہے کہ اس کی جوئے شیر کے لئے راستہ ہموار ہو جاتا ہے ـــ کوہکن، ڈائنامائٹ سے پتھروں کو اڑاتا نہیں۔ اس طریق سے پتھروں کے ٹکڑے اڑا کر دور دور تک رہروؤں کا سر پھوڑ دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات بھاری بھرکم پتھر (BOULDERS) خود جوئے شیر کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں جن کے لئے پھر کسی اور ڈائنامائٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن کوہکن کی سنگ تراشی اس قسم کے خطرات سے مامون ہوتی ہے۔

اس کوہ کنی اور خارہ شگافی کے لئے خارجی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید

خارجی اسباب

نے اپنی سرحدوں کو گھوڑوں کے رسالوں سے مضبوط بنانے کی تاکید کی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ ضرورت استحکامِ خویش (یعنی خود اپنی ذات کے استحکام) کی ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ تیشہ مشتمل ہوتا ہے لکڑی کے دستے اور لوہے کے پھل پر۔ خارجی اسباب و ذرائع تیشہ کا

دستہ ہیں اور اس کا 'پھل' خود انسان کی اپنی ذات ـــ اس کی سیرت و کردار ـــ ہے۔ اگر تیشہ میں دستہ نہیں تو 'پھل' بیکار رہ جاتا ہے۔ اور اگر اس میں "پھل" نہیں یا پھل ہے مگر اس میں سیرتِ فولاد نہیں تو وہ پتھر کو تراش،

استحکامِ خویش

کاٹ نہیں سکتا۔ مضبوط دستہ اور فولادی "پھل" پر مشتمل 'تیشہ ہی' انسانوں کے خود ساختہ الٰہوں (خداؤں) کے سنگہائے گراں بار کو راستے سے ہٹا کر الا اللہ کی جوئے شیر تک لے جا سکتا ہے۔ یہی وہ طریقِ کوہ کنی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ہزار چشمے ترے سنگِ راہ سے پھوٹیں
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

یہ ہے برادرانِ گرامی قدر! زندگی کی وہ حقیقت جس کی نقاب کشائی اقبالؒ نے "جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی" کی نہایت برجستہ اور حسین تشبیہات کے ذریعے کی ہے اور جسے میں نے اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق آپ کے سامنے پیش کیا ہے ـــ وہ بصیرت جو نتیجہ ہے میرے اس مشفق باپ کی تعلیم و تربیت کا جس کی نگہِ عاطفت نے میری فکر کے آہوئے رم خوردہ کو سوئے حرم آنے کے طور طریق سکھائے اور زندگی کی جوئے شیر تک پہنچنے کے راستے بتائے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں نے اس سرچشمۂ حیات کی جھلک دیکھ لی ہے ـــ وہ منزل ابھی دور ہے، اور غالبؔ کے الفاظ میں

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اس جوئے نور کے نغماتِ جانفزا کی دھیمی دھیمی سُریلی لَیں روح میں سمائے جا رہی ہیں جیسے چاندنی رات میں، دور دامنِ کہسار میں، کوئی نے نواز، بنسری پر پہاڑی دھن الاپے چلا جا رہا ہو اور اپنے ساتھ ساری فضا کو نغمہ بار بنا رہا ہو کیسی دلکش ہیں یہ صدائیں اور کیسی پُرکیف ہیں یہ فضائیں!

یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

والسلام!

عزیزہ نجمہ کوثر

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بزرگانِ گرامی قدر ـــ سلام و رحمت!

ماہرینِ علم الانسان کا کہنا ہے کہ انسان نے سب سے پہلے اس چیز کو دریافت کیا جس کے بغیر اس

زمین پر اُس کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ وہ چیز تھی آگ۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اس نے آگ کو کیسے دریافت کیا؟ اتفاق سے ایک پتھر دوسرے پتھر سے ٹکرایا۔ ان کے اس باہمی ٹکراؤ سے ایک چنگاری نکلی اور وہ چنگاری زمین پر آگ کا اولین سرچشمہ بن گئی۔ اس سے واضح ہے کہ انسانی زندگی کی حرارت ساری کی ساری، مرہونِ منت ہیں ٹکراؤ کی۔ یہ اولین چنگاری کہیں باہر سے نہیں آگئی تھی۔ یہ پتھر کے اندر محوِ خواب تھی۔ ٹکراؤ سے یہ بیدار ہوئی اور جوشِ نمود سے نقاب اُلٹ کر باہر آگئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو ہم پتھر جیسا جامد، ساکت، بے حس و حرکت، خاموش دیکھتے ہیں، ان میں بھی زندگی کی رمق اور حرارت کا مستور موجود ہوتا ہے۔ اس چیز کا ٹکراؤ کسی اور شے سے ہو جائے تو اُس کی یہ خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ مردہ کی مردہ رہ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا حسنِ کائنات اور اُس کی رعنائیاں، حیاتِ انسانی اور اُس کی زیبائیاں یہ سب ٹکراؤ کا نتیجہ ہیں۔ ابلیس نے جب کہا تھا کہ

قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو!

تو اُس نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور اگر آپ غور سے مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ سارا قرآن اسی ٹکراؤ کی مسلسل داستان ہے۔ حضرت نوحؑ اور منکر سردارانِ قوم کا ٹکراؤ۔ حضرت ہودؑ اور قومِ عاد کے عیش پسند امراء کا ٹکراؤ۔ حضرت صالحؑ اور قومِ ثمود کے جاگیرداروں کا ٹکراؤ۔ حضرت شعیبؑ اور مدین کے بلیک مارکیٹ کرنے والے تاجروں کا ٹکراؤ۔ حضرت موسیٰؑ اور استبداد کے مجسمہ فرعون، مذہبی پیشوائیت کے نمائندہ ہامان اور نظامِ سرمایہ داری کے سربراہ قارون کا ٹکراؤ۔ حضرت عیسیٰؑ اور رومن شاہنشاہیت اور یہودی علماء و مشائخ کا ٹکراؤ۔ اور پھر حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور دنیا بھر کی سرکش اور مستبد قوتوں کا ٹکراؤ۔ چونکہ اس ٹکراؤ کو ایک فرد کی زندگی کے آخری سانس تک اور نوعِ انسانی کے آخری فرد تک مسلسل قائم رہنا تھا اسلئے حضورؐ نے اپنے بعد ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی جس نے باطل کی ہر قوت کے ساتھ ٹکر لینی تھی۔ اس امت نے ٹکرلی اور اس ٹکراؤ سے نور اور حرارت کی جو چنگاریاں ابھریں انہوں نے اقوامِ عالم کی مردہ رگوں میں بجلیاں دوڑا دیں اور کمزوروں اور نادروں کی تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں مسرتوں کے چراغ جلا دیئے۔ لیکن اس کے بعد شکست خوردہ مستبد قوتوں نے ایک گہری چال چلی اور اس مرتا پا حرکت و حرارت اُمت کو یہ سبق پڑھانا شروع کیا کہ تصادم اور ٹکراؤ ابلیسی روش ہے۔ عاجزی، انکساری، فروتنی، کمزوری خدا کے بندوں کی نشانیاں ہیں۔ صدیوں کی اس مسلسل سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شیر رفتہ رفتہ بھیڑیں بن کر رہ گئے اور مستبد قوتوں کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ رہا۔ چنانچہ اب اس امت کی کیفیت یہ ہے کہ:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس امت کو دوبارہ ٹکرا دینے کے قابل بنانے کے لئے دردمندانِ قوم نے بہت کچھ سوچا۔ ان میں سب سے بلند مقام حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا ہے۔ وہ قرآنِ مجید کے گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے۔ کہ قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی جب تک قوم کے طالب علموں کے قلب و دماغ میں صحیح تبدیلی نہ پیدا ہو۔ یہی وہ طالب علم تھا جسے مخاطب کرکے وہ کہتے تھے کہ

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

یہی وہ تعلیم ہے جسے میرے بابا جی تیس چالیس سال سے عام کر رہے ہیں اور اب اس کو عملی شکل دینے کے لئے انہوں نے ایک نئے انداز کے کالج کی اسکیم تیار کی ہے جس میں قوم کے شاہین بچوں کو یہ سکھایا جائے گا کہ زندگی نہ لبِ ساحل بزم آرائیوں کا نام ہے اور نہ ساحل فراموش سیلاب بن جانے کا نام۔ بلکہ

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

دعا ہے کہ خدا ہمارے اس خضرِ راہ کو لمبی ـــــ بہت لمبی عمر عطا کرے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ خضر کے حق میں لمبی عمر کی دعا ہمیشہ مقبول ہوتی ہے۔

والسلام

عزیزہ سلمیٰ پرویز

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

اپنے انداز کی بھی اک غزل پڑھ مومنؔ
آخر اس بزم میں کوئی تو سخنداں ہوگا

میرے محترم بزرگو! لیجئے آپ کی وہ بیٹی آگئی جس کے روز روز کے شکووں سے تنگ آکر آپ نے سالِ گزشتہ مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اب طلوعِ اسلام کالج بنا کر ہی دم لینگے۔ اور مقامِ تشکر ہے کہ اپنے اس ارادے کو آپ نے بڑی حد تک عملی پیکر بھی عطا کر دیا لیکن اس کا کیا علاج کہ جس کے مقدر میں گلہ اور شکوہ لکھا ہو اس کے لئے مقامِ تشکر میں بھی شکوہ کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ میں غالباً آٹھویں جماعت میں

تھی جب میں نے کالج کی پکار شروع کی تھی۔ آپ نے اپنی بیٹی کی مسلسل پکار کو نوازا اور کالج کی بنیاد رکھ دی لیکن کب؟ جب آپ کی بیٹی بی۔ اے کر چکی۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

میں اس پر بھی خوش تھی کہ میں نہ سہی میرے پیچھے آنے والی میری چھوٹی بہنیں اس سے فائدہ اٹھائیں گی۔ لیکن واحسرتا! کہ میری اس آرزو پر بھی اوس ہی پڑ گئی جب میں نے سنا کہ کالج لڑکوں کے لئے کھل رہا ہے، لڑکیوں کے لئے نہیں — !

میری شکایت پر مجھے یہ کہہ کر دلاسا دیا گیا کہ کالج ابتداءً لڑکوں کے لئے کھل رہا ہے لیکن اس کے بعد لڑکیوں کے لئے بھی انتظام کر دیا جائے گا — یہ غالباً اُس افسانے "کا اثر ہے جس کی رُو سے سمجھا جاتا ہے کہ خدا نے ابتداءً آدمی کو پیدا کیا تھا، اور اس کے بعد عورت کو۔ لہٰذا لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے بیک وقت تعلیم کا انتظام کر دینا" مشیتِ خداوندی" کے خلاف ہوگا۔ میری بہنیں سوچ سکتی ہیں کہ اس منطق کا جواب کیا ہو سکتا ہے، بالخصوص جب خدا کو درمیان میں لے آیا جائے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ یہ بہت جلد ہو جائے گا۔ بہت ہی جلد — میں کون ہوں جو اپنے بزرگوں کی بات پر اعتماد نہ کروں — بزرگوں کی بات پر اعتماد کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر

تری محبت کا بھی یقیں ہے تری وفاؤں کو مانتا ہوں
مگر مرا دل لرز رہا ہے، میں اپنی قسمت کو جانتا ہوں

میری قسمت میں شاید ابھی کچھ اور سال اپنی پکار کو دہراتا لکھا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ لڑکیوں کی قسمت کا لکھا اَمٹ ہوتا ہے۔ میری بڑی بہن نے ابھی ابھی ٹکراؤ کا ذکر کیا۔ اور بہت خوب کیا — اس نے بتایا کہ اوّلین ٹکراؤ سے آگ پیدا ہوئی اور آگ زندگی کی حرارت سامانیوں کا موجب بنی — بجا اور درست! لیکن وہ ایک بات بھول گئیں جسے بابا جی ہمیں اکثر سنایا کرتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ انہوں نے کانگڑہ کی پہاڑیوں میں دیکھا کہ سردیوں میں پہاڑی لوگ لکڑیوں کا الاؤ لگاتے، اسے تاپتے اور ارد گرد بیٹھ کر آگ تاپتے۔ بندر انہیں یہ کچھ کرتا دیکھتے۔ وہ بھی صبح کو لکڑیاں اکٹھی کر کے الاؤ سا بناتے، اور اس کے گرد اسی طرح بیٹھ کر بغیر آگ جلائے بزعمِ خویش آگ تاپتے اور تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر چلے جاتے۔ (جو کام تقلیداً کیا جائے اس میں ہوتا ہی یہ ہے کہ اس کی شکل و صورت اصل کی سی ہوتی ہے لیکن وہ زندگی کی حرارت سے عاری ہوتا ہے) خیر وہ بندر اسی طرح اُٹھ کر چلے جاتے اور گاؤں کے لوگ ان کی جمع کردہ لکڑیاں اٹھا کر لے جاتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بندر کو آگ جلانی نہیں آتی۔ یہ فطرت کا بڑا احسان ہے، ورنہ سوچئے کہ اگر بندر کو آگ جلانا آتا تو دنیا کا نقشہ

کیا ہوتا ؟ ـــــ وہی نقشہ جو ہیروشیما اور ویت نام میں سامنے آیا ہے جس کا المیہ مسجدِ اقصیٰ میں دیکھا گیا ہے۔ جس کے شعلوں کی لپٹیں احمد آباد میں جہاں سوزی کا چنگیز خانی منظر پیش کر رہی ہیں۔ لہٰذا آگ انسان کے ہاتھ میں ہو تو وجہِ تپشِ حیات۔ لیکن اگر وہی آگ انسان نما بندروں کے ہاتھ لگ جائے تو عالمگیر تباہی کا موجب۔ اقبالؔ کے الفاظ میں :

لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

باقی رہا ٹکراؤ، تو اس میں شبہ نہیں کہ ٹکراؤ سے خفتہ صلاحیتیں بیدار اور افسردہ توانائیاں نمودار ہو جاتی ہیں۔ لیکن جس فرہادِ کوہکن کی داستان میں تیشہ و سنگ کے ٹکراؤ سے جوئے شیر کا سراغ ملتا ہے، اُسی داستان سے ایک اور قسم کا ٹکراؤ بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب جوئے شیر کے راستے میں آخری پتھر رہ گیا تو ایک بڑھیا' سیاہ لباس میں ملبوس' کھلے بال' پریشاں حال، روتی پیٹتی اُس کے پاس آئی۔ فرہاد نے پوچھا کہ تیرا یہ حال کیوں ہے ؟ اس نے کہا کہ آج اچانک شیریں کا انتقال ہو گیا ہے جس کے سوگ میں سارا ملک مصروفِ آہ و فغاں ہے۔ یہ سنتے ہی فرہاد جذبات سے مغلوب ہو گیا اور وہی تیشہ جو اُس نے آخری پتھر پر مارنا تھا، خود اپنے سر پر دے مارا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دنیا میں اکثر ٹکراؤ ایسے ہی ہوتے ہیں جن میں سنگ تراش تیشے کو پتھر پر مارنے کے بجائے خود اپنے سر پر مار لیتے ہیں جس کا نتیجہ خون کے وہ فوارے ہوتے ہیں جنہیں ہم نے گزشتہ فسادات میں مال روڈ اور جی۔ پی۔ او کے سامنے چھوٹتے دیکھا تھا ـــ جو جذبات سے مغلوب ہو کر پاگل ہو جائیں' ان کے ہاتھ سے تیشے چھین لینے چاہئیں ـــ ٹکراؤ' میرے عزیز بھائیو اور بہنو ! ایک ہی ایسا ہے جو جوئے شیر لانے کا موجب بنتا ہے اور وہ ہے حق اور باطل کا ٹکراؤ۔ اس سے دنیائے انسانیت کی صلاحیتیں اُبھرتیں' رعنائیاں نکھرتیں، بہاریں مسکراتیں، مسرتیں اُچھلتیں اور شادمانیاں ناچتی ہیں۔ اور یہی وہ ٹکراؤ ہے جس سے تیشۂ فرہاد صدیوں سے محروم ہے اور جس کے انتظار میں' جوئے شیر کا ہر قطرہ بیتاب' تڑپ تڑپ کر کہہ رہا ہے کہ

آ ـــ اے میری بے چین نگاہوں کے سہارے
مدت سے تری راہ گذر دیکھ رہا ہوں

میری بہن نے بابا جی کے لئے عمرِ خضر کی دعا مانگی ہے لیکن میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ اُن کی درازیٔ عمر تو بے شک خضر کی سی ہو لیکن کیفیت عمرِ خضر جیسی نہ ہو۔ وہ کیفیت جس کے متعلق کہنے والے نے کہا ہے کہ ؎

یہ سب سے منہ چھپانا کوئی اچھی زندگانی ہے !
خضر ! تم نے تو غارت کر کے عمرِ جاوداں رکھدی

میری دعا ہے کہ بابا جی کو خورشید جہاں تاب کی سی عمر عطا ہو۔ کہ

اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے ۔

آخر میں میرے محترم بزرگو! میں آپ کی خدمت میں معصوم بیٹیوں کا سا محبت بھرا سلام عرض کرتی ہوں۔ میں سلام کہتی ہوں آپ مجھے اسیس دیجئے۔ والسلام!

اختتامیہ

(محترمہ صدر مذاکرہ)

عزیزانِ من! آپ نے ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقہ کے ان نمائندوں کو دیکھ لیا جنہوں نے قرآنی فضا میں فکری تربیت حاصل کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ اگر فکرِ بیباک کو قرآنی اقدار کے ساحل مل جائیں تو وہ سیلاب بے پناہ بننے کی بجائے زندگی کی صاف اور شفاف ندی بن سکتا ہے اور یہی انسانی صلاحیتوں کے صحیح مظاہر ہیں۔

میں اپنی طرف سے اور آپ تمام حضرات کی طرف سے دلی شکریہ ادا کرتی ہوں بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا، جس کے حسنِ انتظام سے ہمیں اس قدر مفید علمی مذاکرہ سے استفادہ کا موقع ملا۔ نیز شکریہ ادا کرتی ہوں اپنے ان عزیز بچوں، بھائیوں اور بہنوں کا جنہوں نے اس مذاکرہ میں شرکت سے ہمیں زندگی کے بنیادی عناصر و عوامل سے آگاہ کیا۔ آخر میں شکریہ ادا کرتی ہوں آپ تمام حضرات کا جنہوں نے نہایت سکون اور متانت سے اس مذاکرہ کے کامیاب ہونے میں تعاون کیا۔ اور ان تشکرات کے بعد شکر یہ ہے ذاتِ باری تعالیٰ کا جس نے ان بچوں کو عمدہ انسانی صلاحیتوں سے نوازا۔

میری دعا ہے کہ خداوندکریم قوم کے سلیم بیٹوں اور طاہرہ بیٹیوں کو نیک اطوار و بلند کردار سے ایک صحیح اسلامی معاشرہ قائم کرنے کا اہل بنائے۔ آمین!

والسلام!

پریمیئم
کم دیجئے

بونس
زیادہ لیجئے

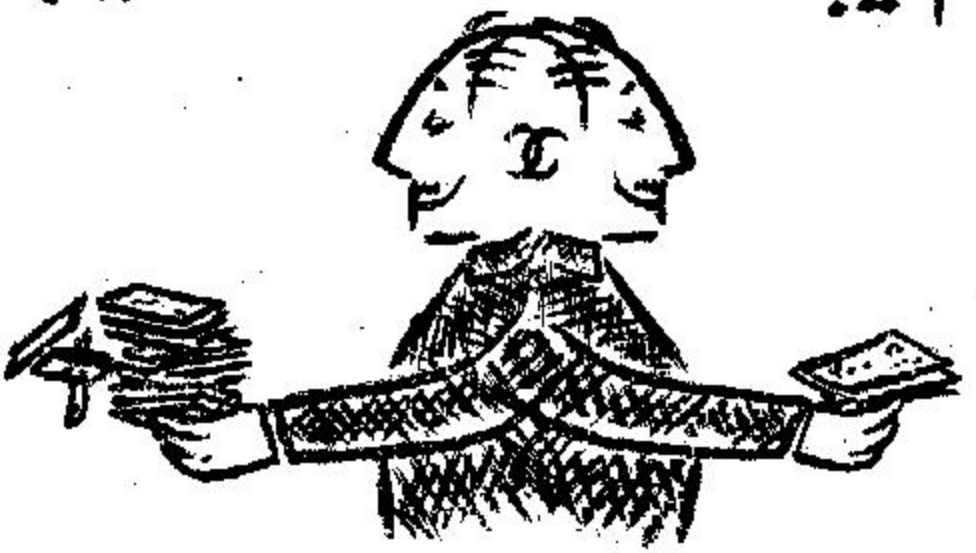

دونوں طرح فائدہ ہی فائدہ

بیمہ شدہ رقم کے ہر ہزار روپیہ پر

پریمیئم	بونس
۳۵ سال کی عمر میں لی گئی تیس سالہ پالیسی پر	برائے ۶۹-۱۹۶۸ء
جین حیات پالیسی پر ۲۶ روپے ۸۰ پیسے سالانہ	جین حیات پالیسی پر ۴۲ روپے
میعادی پالیسی پر ۳۱ روپے سالانہ	میعادی پالیسی پر ۳۳ روپے

پوسٹل لائف انشورنس

PLI-2/69